بچوں کا پسندیدہ رسالہ
ماہنامہ
ساتھی
کراچی
فروری ۲۰۱۶ء
میرے وطن!
تیری جنت میں آئیں گے اک دن
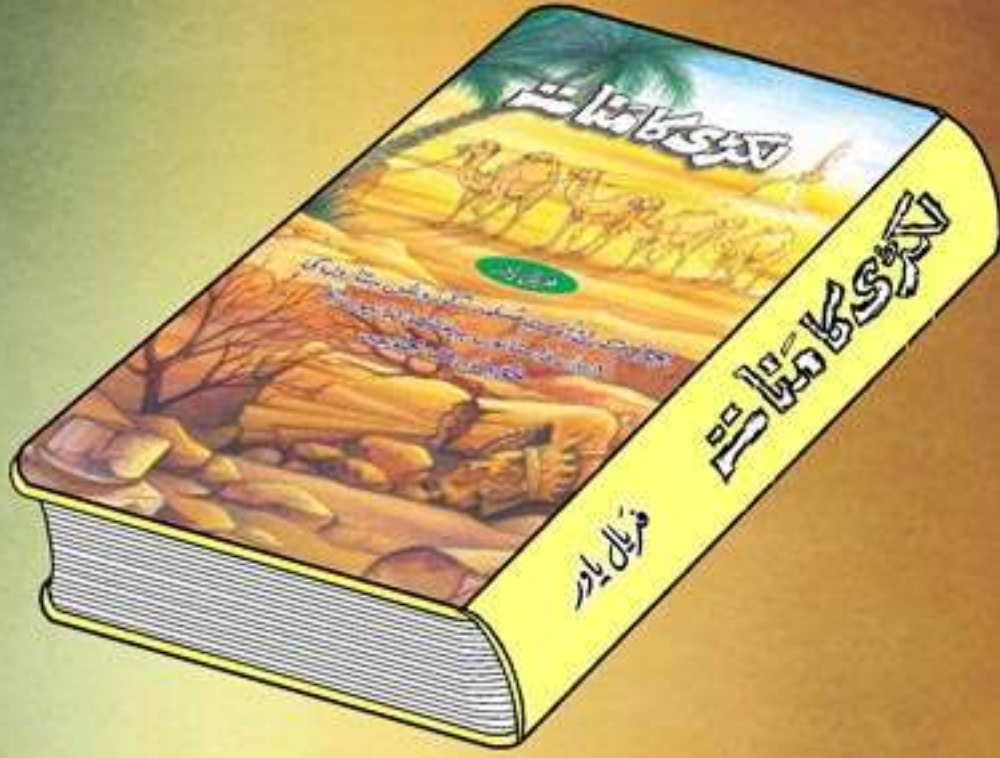
نسلِ نو کا منفرد ادبی ترجمان
ماہنامہ
ساتھی
کراچی
جلد نمبر ۲۸ شمارہ نمبر ۲
فروری ۲۰۱۶ء
قیمت ۳۰ روپے
مدیر
فصیح اللہ حسینی
مجلسِ ادارت
محمد طارق خان
عبدالصمد بھٹی
عبدالرحمٰن المومن
0334-3024835
شعبہ مارکیٹنگ
سید طلال علی
0333-2381277
اسامہ شیخ
0336-2246181
محمد یوسف منیر
سالانہ خریداری
رجسٹرڈ ڈاک 500 روپے
مشرقِ وسطیٰ 75 ریال
دیگر ممالک 35 ڈالر
رابطہ کیجیے
ایف 206، سلیم ایونیو بلاک 13-B
گلشن اقبال، کراچی
پوسٹ بکس نمبر: 17982
فون نمبر: 34976468
اوقاتِ کار: شام ۵ تا رات ۱۰ بجے
monthlysathee@hotmail.com
satheecirculation@gmail.com
www.facebook.com/monthlysathee
ناشر: سرفراز احمد

دل پہ دستک

کبھی آپ امتحان میں ناکام ہوئے ہیں؟ نہیں ہوئے؟ اچھا آپ کے امتحان میں نمبر تو کبھی نہ کبھی کم ضرور آئے ہوں گے۔ کیا کہا آپ ہر بار اچھے نمبروں سے پاس ہوتے ہیں؟ اچھا بھئی مان لیتے ہیں کہ آپ کا شمار اچھے طالب علموں میں ہوتا ہے۔ آپ کی کوئی چیز غائب تو ضرور ہوئی ہوگی۔ (شکر ہے آپ نے مان لیا ورنہ ہم تو آپ کو کسی اور دنیا کی مخلوق سمجھتے)۔ جب آپ کی چیز غائب ہوتی ہے تو آپ کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟ چلیں چھوڑیں آپ کی بات نہیں کرتا۔ مجھے تو افسوس ہوتا ہے اور دل چاہتا ہے کہ مجھے کسی طرح پہلے ہی علم ہو جائے کہ میری کوئی چیز غائب ہونے والی ہے تاکہ میں اس کا خیال رکھ سکوں۔ کیا کہا آپ نے؟ ایسا لگتا ہے کہ میں تقدیر جاننا چاہتا ہوں! تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ آپ بھی یہ خواہش رکھ سکتے ہیں اس کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکتے ہیں۔ جی ہاں اقبال کہتے ہیں کہ آپ اپنی تقدیر نہ صرف جان سکتے ہیں بلکہ اسے خود لکھ سکتے ہیں۔ لیکن اس کے لیے آپ کو کچھ کرنا ہوگا! پریشان نہ ہوں علامہ اقبال یہ بھی بتا رہے ہیں کہ آپ کو اپنی تقدیر لکھنے کے لیے کیا کرنا ہوگا۔ آپ کو ایک ایسی ہستی کو اپنا رہنما بنانا ہوگا جو دنیا اور آخرت کی کامیاب ترین ہستی ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی رہنمائی کے لیے منتخب کیا اور جس کے طرزِ زندگی کو اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کے لیے بہترین نمونہ قرار دیا۔ جی آپ ٹھیک سمجھے ہم اللہ کے محبوب نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کر کے نہ صرف اپنی تقدیر جان سکتے ہیں بلکہ اپنی تقدیر خود بنا سکتے ہیں، کیوں کہ

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

ساتھی چٹخارے

السلام علیکم

اللہ تعالیٰ نے زمین پر لوہا اتارا لیکن اس کو مشین کی طرز پر ڈھالنے کا کام انسان کے سپرد کر دیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے زندگی گزارنے کے طور طریقے بھی بتلا دیے۔ اب انسان پر منحصر ہے کہ وہ کسی راہ کا انتخاب کرتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کے غور وفکر اور اس کے نتیجے میں تدبیر کی عملی مثالیں بھی دی ہیں۔ مثلاً اللہ نے دنیا میں دو قسم کے درخت پیدا کیے۔ ایک بیل اور ایک تناور درخت۔ بیل تیزی سے پھلتی پھولتی ہے۔ زمین کے اوپر ہی آگے ہی آگے بڑھتی ہے اور بہت کم وقت میں پھل پھول دے کر ختم ہو جاتی ہے۔ جبکہ اس کے مقابلے میں تناور درخت طویل عرصہ لیتا ہے۔ کچھ درخت مہینوں میں، کئی سال اور کچھ صدیوں میں پرورش پاتے ہیں۔ ان درختوں کی جڑیں بہت گہری اور مضبوط ہوتی ہیں۔ انسان کی مثال بھی ایسی ہے۔ کچھ مختصر راستوں پر سفر کر کے جلدی جلدی ثمرات سمیٹنے کی کوشش کرتے ہیں اور بہت کم وقت میں، بہت کم ثمرات سمیٹ کر دوسروں کو بہت کم فائدہ پہنچاتے ہیں اور پھر بیل کی طرح ان کا نام ونشان مٹ جاتا ہے۔ کچھ انسان صبر، عزم وحوصلے سے اپنا موثر کردار معاشرے پر ثبت کرتے ہیں اور ہمیشہ کے لیے امر ہو جاتے ہیں۔ دوسروں کو دیر تک فائدہ پہنچاتے ہیں۔ آپ ان میں سے کس کا انتخاب کرتے ہیں؟ یہ آپ کے ہاتھ میں ہے.....تناور درخت بنیں یا بیل.....

والسلام

آپ کا ساتھی

فصیح اللہ حسینی

میں اُداس ہوں

محمد مصطفیٰ سونگی

کالج میں پڑھنے والے ایک لڑکے کی کہانی......اُس کے اُداس ہونے کی وجہ عجیب تھی

اماں جی اس وقت رات کے ساڑھے آٹھ بجے ہیں۔ میں آپ کی ہدایت کے مطابق کھانا کھا کر اور تھوڑی سی چہل قدمی کر کے واپس اپنے کمرے میں آ گیا ہوں اور اب حسب معمول آپ کو دن بھر کی کارگزاری لکھ رہا ہوں لیکن نہیں آج میں آپ کو اپنی کارگزاری نہیں لکھوں گا، کیوں کہ آج میں بہت اُداس ہوں۔

میں اُداس اس لیے نہیں ہوں ماں جی کہ میں آپ سے بہت دور، اپنے گاؤں اور اپنے دوستوں سے بہت دور اس اجنبی شہر میں پڑا ہوں اور اپنے آپ کو بے یار و مددگار محسوس کرتا ہوں۔ میں اس لیے بھی اُداس نہیں ہوں ماں جی کہ میری کسی غلطی پر آج کالج میں مجھے

ڈانٹ پڑی ہے یا تعلیم حاصل کررہا ہوں۔ میرے روزمرہ کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا اسی طرح صبح تڑکے اٹھتا ہوں، کالج جاتا اور کالج سے سیدھا گھر آتا ہوں۔

تو پھر میں کیوں اُداس ہوں؟ آپ پریشان ہورہی ہوں گی۔ کہیں مجھے روپے پیسے کی تو ضرورت نہیں، کسی سے میرا جھگڑا تو نہیں ہوگیا، میں جس مکان میں رہتا ہوں، وہاں تو کوئی تکلیف نہیں۔ نہیں ماں جی! مجھے اس طرح کی کوئی تکلیف نہیں ہے۔ جب تک آپ کا سایہ میرے سر پر موجود ہے، مجھے اس طرح کی کوئی تکلیف نہیں ہوسکتی......تو پھر میں کیوں اداس ہوں؟

میں خود نہیں جانتا ماں جی...... کہ میں کیوں اُداس ہوں۔ اس طرح معمولی معمولی باتوں پر میں اگر اُداس اور غمگین رہنے لگا تو آپ کی وہ امیدیں کیسے پوری ہوں گی، جو آپ نے مجھ سے وابستہ کررکھی ہیں۔ میں دن بھر اپنے آپ کو سمجھاتا رہا ہوں اور اس واقعے کو بھولنے کی کوشش کرتا رہا ہوں، جو میری اس لایعنی سی اُداسی کا سبب بنا ہے لیکن پچھلے دنوں میں نے ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ انسان کسی بات کو بھلانے کی جتنی کوشش کرتا ہے وہ اتنی ہی شدت سے نئے اور پریشان کن پہلوؤں کے ساتھ سامنے آجاتی ہے۔

شاید میری اُداسی کچھ کم ہوسکے، اس لیے میں وہ واقعہ من وعن بیان کرتا ہوں جو آج صبح میرے ساتھ پیش آیا اور جس کے متعلق میں دن بھر سوچتا رہا ہوں

ہوا یہ کہ آج صبح جب میں کالج جانے کی تیاری کررہا تھا تو بلا اجازت دروازے پر دستک دیے ایک عورت میرے کمرے میں چلی آئی اور اس طرح بلا اجازت بغیر کچھ کہے سنے میرے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ کسی عورت کے اس طرح میرے کمرے میں گھس آنے کا ذکر پڑھ کر آپ پریشان نہ ہوں، کیوں کہ اس عورت کی عمر آپ کی عمر سے بھی زیادہ تھی۔ جب میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو اسی طرح جیسے پیار سے آپ مجھے 'بیٹا' کہہ کر پکارتی ہیں، اس نے بھی مجھے 'بیٹا' کہا۔ اس نے کہا: ''بیٹا! میں تمھیں ایک تکلیف دینے آئی ہوں۔''

یہ کہہ کر اس نے ایک مڑا تڑا لفافہ میری طرف بڑھا دیا اور بڑے اشتیاق سے بولی ''میرے بیٹے کا خط ہے۔''

میں نے کسی حیل و حجت کے بغیر فوراً خط پڑھا۔ کوئی خاص بات خط میں نہیں لکھی گئی تھی۔ بالکل عام سا خط تھا، جیسے میں ہر روز آپ کو لکھتا ہوں۔ یہی کہ میں بہت اچھی طرح سے ہوں، آپ بہت یاد آتی ہیں، آپ سے ملنے کو بہت دل چاہتا ہے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ جوں جوں میں خط پڑھ رہا تھا، مارے خوشی کے اس کی حالت عجیب ہورہی تھی، جیسے وہ مجھ سے خط نہ سن رہی ہو بلکہ اپنے پیارے بیٹے کے میٹھے میٹھے بول خود اس کی زبان سے سن رہی ہو۔ جیسے وہ خط نہ آیا ہو،

خوداس کا بیٹا آ گیا ہو۔اس کی حالت دیکھ کر مجھے آپ کی بہت یاد آئی۔ اس ماں کے روپ میں مَیں نے اپنی ماں کو دیکھ لیا۔ اپنی پیاری ماں کو جو اس طرح میرے خطوں پر پھولے نہیں سماتی ہوگی۔ میرا دل آپ سے ملنے کو بے قرار ہو اُٹھا۔ بیچ بیچ میں ٹوک کر اس نے ایک ایک جملہ کئی کئی بار سنا اور ہر جملے پر اپنے بیٹے کو لاکھ لاکھ دعائیں دیں۔ ساتھ ساتھ مجھے بھی دعائیں دیں کہ میں اسے اس کے بیٹے کا خط پڑھ کر سنا رہا ہوں۔ 'ورنہ' اس نے ماتھے پر تیوری چڑھا کر کہا: ''بیٹا یہاں کے لوگ تو ایسے تو تا چشم ہیں کہ کسی کا خط پڑھ کر نہیں دیتے۔ اُلٹا دھتکار دیتے ہیں۔''

دوسری باتوں کے علاوہ خط سننے کے دوران میں ہی اس نے بتایا کہ وہ میرے قریب پڑوس میں رہتی ہے اور بلاناغہ مجھے کالج جاتے اور کالج سے لوٹتے ہوئے دیکھا کرتی ہے۔ اس کے بیٹے کی عمر اور میری عمر میں مشکل سے ایک دو سال کا فرق ہوگا۔ وہ بھی میری طرح بہت ہنس مکھ اور دوسروں کے کام آنے والا ہے۔

''کتنی خوش نصیب ہیں وہ مائیں'' یکا یک اُچک کر اس نے میرا ماتھا چوم لیا: ''جن کے بیٹے ایسے خوبیوں بھرے ہوں۔'' اور جب میں نے خط کے وہ جملے دہرائے جن میں اس کے بیٹے نے لکھا تھا کہ اس نے چھٹی کی درخواست دے رکھی ہے اور چھٹی ملتے ہی وہ اپنی پیاری ماں سے ملنے آئے گا تو مارے خوشی کے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پھر بڑے فخر سے بولی: ''دیکھا! کتنا اچھا ہے میرا بیٹا'' اور پھر وہ کافی دیر تک اپنے بیٹے کی تعریفیں کرتی رہی۔ اس نے بتایا کہ کس طرح شوہر کی وفات کے بعد انگلیوں کی پوریں توڑ توڑ کر اس نے اسے پالا پوسا اور پڑھایا لکھایا تھا اور اب...... اب اس کے سارے دکھ درد دور ہو گئے ہیں۔ ایسا نیک اور ایسا سعادت مند بیٹا خدا ساری دنیا کی ماؤں کو دے اور پھر بڑے رازدارانہ لہجے میں اس نے کہا: ''میں نے اس کے لیے چاند سی لڑکی دیکھ رکھی ہے۔ آتے ہی بیاہ کر دوں گی۔'' اور بالکل بچوں کی سی خوشی کے ساتھ وہ تالیاں بجانے لگی۔

ماں جی! آپ سوچ رہی ہوں گی کہ یہ تو کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ ہر ماں اپنے بیٹے سے اتنا ہی پیار کرتی ہے اور آپ تو مجھے اس سے بھی زیادہ پیار کرتی ہیں اور پھر اس واقعے سے میں اُداس کیوں ہوا؟

یہاں مجھے اُداس نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ایسی معمولی معمولی باتوں پر میں اُداس رہنے لگا تو آپ کی وہ امیدیں پوری نہ ہو سکیں گی، جو آپ نے مجھ سے وابستہ کر رکھی ہیں اور جنھیں پورا کرنے کی میں نے آپ کے سامنے قسم کھائی تھی۔ لیکن بات یہ ہے کہ ماں جی! وہ خط آج سے ۲۵ برس پہلے کا لکھا ہوا تھا اور کسی محاذِ جنگ سے آیا تھا۔

☆......☆

ڈھونڈو گے تو جانیں گے……ورنہ ہم نہ مانیں گے
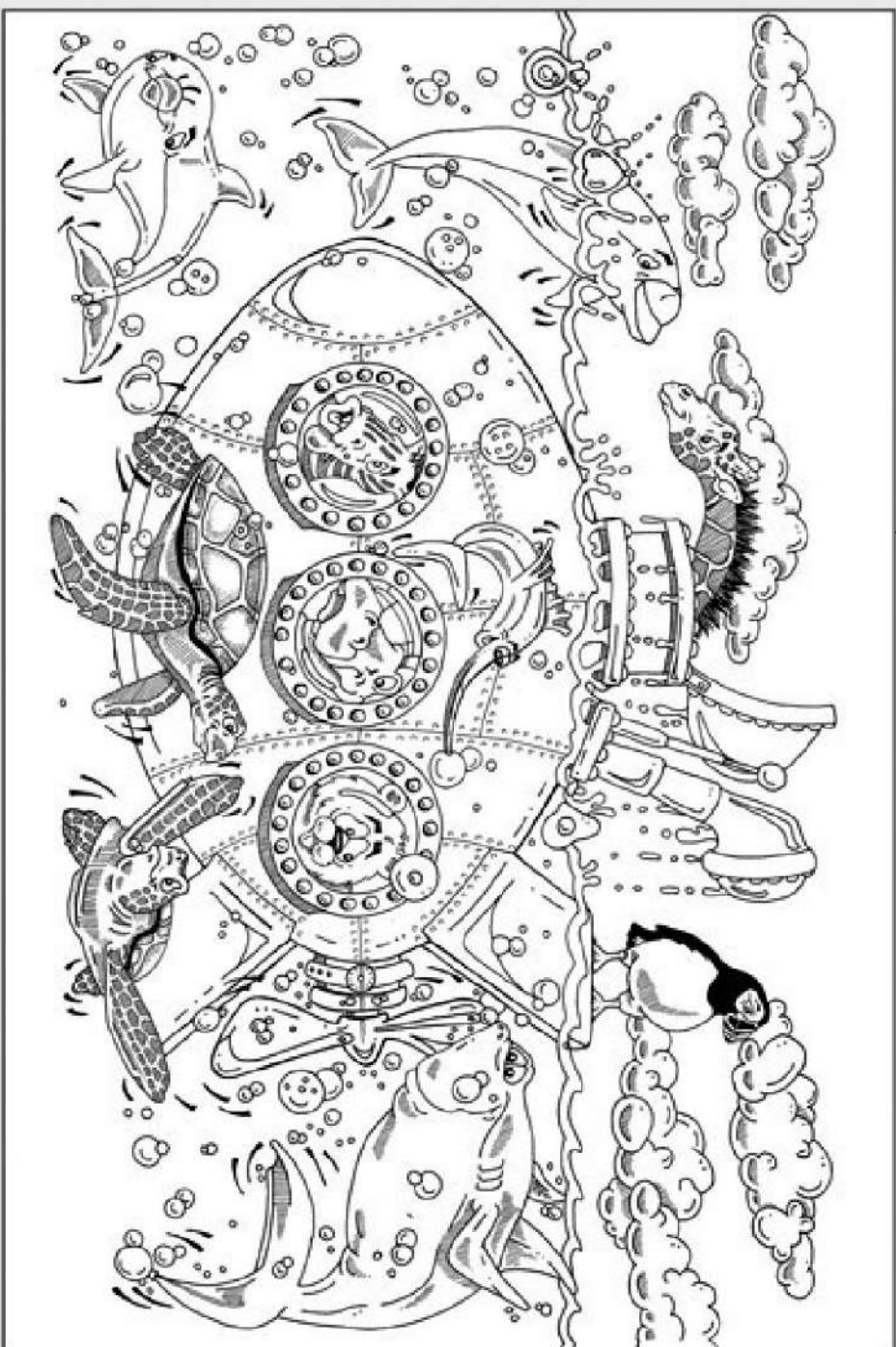
ہمارے نبیؐ کی بڑی شان ہے — جہاں پر بڑا ان کا احسان ہے

وہ آئے چمن میں بہار آگئی — ہر اک دشت و بن میں بہار آگئی

فلک سے ہُوا رحمتوں کا نزول — کِھلے نیکیوں کے ہر اک سمت پھول

اندھیرے میں حق کا جلایا چراغ — مٹایا، زمانے سے باطل کا داغ

کیا اس جہاں سے برائی کو دُور — بھلائی کا انساں کو بخشا شعور

جو ذرّہ تھا اس کو گُہر کر دیا — شبِ غم کو رشکِ سحر کر دیا

بلند آج حق کی جو آواز ہے — ہمارے نبیؐ کا یہ اعجاز ہے

ہیں بے شک وہ انسانیت کے امام
ہو ان پر ہزاروں درود و سلام

انسانیت کے امام

عباس العزمؔ

یہ نظم عباس العزم صاحب نے اپنی وفات سے قبل بھیجی تھی

فاتحِ اُندلس

سید سمیر احمد

موسیٰ بن نصیر: ''تم کون ہو؟ اور تمھیں میرے پاس کس نے بھیجا ہے؟''

کاؤنٹ جولین: ''میں اندلس کا ایک عیسائی نواب ہوں اور مجھے طارق بن زیاد نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ وہ آپ کے قابلِ اعتماد سپہ سالار ہیں۔ میں نے اپنی قوم کا مسئلہ ان کے سامنے رکھا تھا۔ اُنھوں نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ اگر اندلس کے ظالم عیسائی بادشاہ راڈرک کی زیادتیوں کا ازالہ چاہتے ہو تو افریقا کے گورنر موسیٰ بن نصیر سے بات کرو، شاید وہ زیادہ بہتر تجویز دیں۔''

موسیٰ بن نصیر: ''تم کیا چاہتے ہو؟''

کاؤنٹ جولین: ''ہم چاہتے ہیں کہ جو پُر امن

نظام مسلمانوں نے اپنی ریاست میں قائم کر رکھا ہے ویسا ہی پُرامن اور محبتوں سے بھرپور نظام ہمارے ملک میں بھی آ جائے۔ ہم اپنے بادشاہ کے مظالم سے تنگ آئے ہوئے ہیں۔ ہم آپ کو دعوت دیتے ہیں کہ آپ سمندر پار کر کے ہمارے ملک پر حملہ آور ہوں اور راڈرک کے ظلم وستم سے نجات دلائیں۔ ہماری نسلیں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھلا سکیں گی۔''

موسیٰ بن نصیر: ''ہم ان شاء اللہ تمھیں ظالم کے ظلم سے ضرور نجات دلائیں گے لیکن تم ہمارے لیے کیا کر سکتے ہو؟''

کاؤنٹ جولین: ''ہم آپ کو تمام ممکنہ وسائل فراہم کریں گے۔ خوراک، اسلحہ، سواریاں اور سب سے بڑھ کر ہمارے مظلوم عوام اور کئی اُمرا ظلم کے خلاف آپ کا ساتھ دیں گے۔''

افریقا میں اسلامی سلطنت کے مستحکم ہونے کے بعد موسیٰ بن نصیر کی نظریں یورپ کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ یورپ میں بھی اسلام کی روشنی پھیلائی جائے اور اہل یورپ کو جہالت کے گھٹا ٹوپ اندھیروں سے نکالا جائے۔ اُنھوں نے سوچا کہ اس سے اچھا موقع اور کون سا ہوگا جب اسلام کی فیوض و برکات سے متاثر ہو کر یورپ کے عوام از خود مسلمانوں کو حملہ آور ہونے کی دعوت دیں تاکہ وہ لوگ بھی اسلامی نظام کے ثمرات سے مستفید ہو سکیں۔

موسیٰ بن نصیر نے اسلامی حکومت کے خلیفہ کو اندلس پر حملے کا کا پیغام بھیجا۔ خلیفہ کا جواب آیا کہ مسلمانوں کو سمندر کے خطرات میں پھنسانا مناسب نہیں ہے۔ پہلے وہاں کے حالات معلوم کیے جائیں۔ موسیٰ بن نصیر نے جواب بھیجا کہ بیچ میں کوئی بڑا سمندر حائل نہیں بلکہ ایک آبنائے ہے جس کے کنارے اُندلس کے پہاڑ اور باغات صاف نظر آتے ہیں۔ اس پر خلیفہ نے اجازت دے دی۔

پہلے تو موسیٰ بن نصیر نے آزمائشی حملے کروائے۔ ساحل کے کئی علاقوں پر کامیابی سے قبضے کر لیے۔ اس سے اندازہ ہو گیا کہ اندلس کے حکمران نے اپنے ساحلوں کی حفاظت کا کوئی خاطر خواہ بندوبست نہیں کیا ہے۔ اب اندلس پر فیصلہ کن حملے کی تیاریاں شروع کر دی گئیں۔ سات ہزار سرفروشوں کی فوج تیار کی گئی اور طارق بن زیاد کو ان کا سپہ سالار بنا دیا گیا۔ طارق بن زیاد افریقا کی بربر قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ جب موسیٰ بن نصیر نے افریقا کی فتوحات شروع کی تھیں اس وقت طارق بن زیاد ان کے غلام تھے۔ موسیٰ بن نصیر کی صحبت میں رہ کر اُنھوں نے اسلام قبول کر

لیا۔ وہ بڑے متقی، فرض شناس اور ذہین تھے۔ اپنی شجاعت و بہادری کے ذریعے اسلام کے سچے سپاہی ثابت ہوئے تھے۔ موسیٰ بن نصیر نے ان کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر اُنھیں آزاد کر دیا تھا اور مجاہدین کا سپہ سالار بنا دیا تھا۔ رجب ۹۲ ہجری کو لشکرِ اسلامی کا بیڑا اندلس کے ساحل پر لنگر انداز ہوا۔ طارق بن زیاد نے ایک بلند پہاڑ کے نزدیک پڑاؤ ڈالا۔ یہ پہاڑ آج کل ''جبل الطارق'' (جبرالٹر) کہلاتا ہے۔ طارق بن زیادہ نے یہاں پڑاؤ ڈالنے کے بعد ایک انوکھا کام کیا۔ اُنھوں نے چند بحری جہازوں کو آگ لگوادی کہ کوئی واپسی کا خیال دل میں نہ آئے۔ جان ہتھیلی پر رکھ کر آگے بڑھنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

اندلس کا ایک عیسائی امیر اپنے چھوٹے سے لشکر کے ساتھ گزر رہا تھا۔ اس نے جو اتنی بڑی فوج ساحل پر لنگر انداز دیکھی تو دم بخود رہ گیا۔ نہ ساحل پر کوئی بحری جہاز، نہ بار برداری کے لیے اونٹ۔ اس نے انھی سوچوں میں مستغرق اپنے بادشاہ راڈرک کے پاس پیغام بھجوایا کہ اندلس پر ایک ایسی فوج حملہ آور ہورہی جن کا نہ وطن ہے نہ شناخت، ان کی اصلیت نہیں معلوم، کہاں سے آئے ہیں کچھ نہیں پتا، زمین سے پھوٹے ہیں یا آسمان سے ٹپکے ہیں۔

راڈرک کو خبر ملی تو اس نے آناً فاناً ایک لاکھ سپاہوں کی فوج تیار کی اور اجنبی لشکر سے مقابلے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ اِدھر طارق بن زیادہ کو جاسوسوں نے خبر دی کہ راڈرک ایک لاکھ فوج لے کر آرہا ہے۔ طارق نے موسیٰ بن نصیر سے مزید کمک طلب کی۔ موسیٰ نے پانچ ہزار مجاہدین اور بھیج دیے۔ اب طارق بن زیاد کے پاس بارہ ہزار سپاہی تھے۔ طارق کی جنگی حکمت عملی کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ اس نے ایک ایسی جگہ منتخب کی جس کی پشت پر ایک میٹھے پانی کی جھیل تھی کہ پیچھے سے کوئی حملہ نہیں کر سکتا تھا۔ مجاہدین کے لیے پانی بھی آسانی سے دستیاب تھا۔ یہ جگہ وادی الکبیر کہلاتی ہے۔ رسد اور کمک کے تمام انتظامات یہاں پر موجود تھے۔ ایک جانب بلند پہاڑ تھے دوسری جانب میدان۔ اس طرح اسلامی فوج شہادت کے جذبے سے سرشار اپنے محبوب سپہ سالار کے اشارے کی منتظر تھی۔ اب طارق بن زیاد نے اپنے بارہ ہزار سرفروشوں کا حوصلہ بلند کرنے اور ولولہ تازہ کرنے کے لیے ایک تقریر کی۔

۲۷ رمضان ۹۲ ہجری کی صبح تھی جب دونوں حریف میدان میں صف آرا ہوئے اور طبلِ جنگ

بچ گیا۔ دنیاوی آسائشوں سے بے پروا اور جنت کی نعمتوں کے طلب گار اللہ کے سپاہی دشمن پر بے خوف و خطر ٹوٹ پڑے۔ گھمسان کا رَن پڑا۔ ہر طرف خون ہی خون، لاشیں ہی لاشیں۔ کراہتے ہوئے زخمی، آہ و بکا کا طوفان۔ صبح کا ستارہ اندلس کی زمین پر ہولناک مناظر دیکھتا ہوا رات کی آغوش میں پناہ گزین ہو گیا اور اس روز جنگ کا فیصلہ نہ ہو سکا۔

کفر و اسلام کی یہ جنگ سورج نے آٹھ بار دیکھی۔ رات کو ستارے طارق کو خدائے بزرگ کے سامنے سربسجود دیکھتے اور دن میں گھوڑے کی پیٹھ پر۔ بالآخر طارق بن زیاد نے فیصلہ کن وار کرنے کا ارادہ کرلیا۔ وہ چند جاںنثاروں کے ساتھ اپنا گھوڑا لے کر دشمن کے قلب میں جا گھسے۔ راستہ چھٹتے ہی دیگر مجاہدین ان کے پیچھے پیچھے راڈرک کی فوج پر برق بن کر ٹوٹ پڑے۔ آٹھ دن کی تھکی ماندی عیسائی فوج میں ایسی بھگدڑ مچی کہ راڈرک کو فرار کی پڑی۔ وہ گھوڑے کو ایڑ لگا کر ایک جانب فرار ہوا۔ لیکن موت اس کے تعاقب میں تھی۔ وہ راستہ بھٹک کر دریائے رباط کی دلدلی زمین میں جا پہنچا اور گھوڑے سے گر کر دلدل میں گمنامی کی موت مرا۔

راڈرک کا فرار ہونا تھا کہ میدان صاف ہو گیا۔ دریائے رباط کی دلدل ظالم راڈرک کو نگل چکی تھی۔ ایک لاکھ سپاہی پسپا ہو چکے تھے۔ کئی جان بچا کر بھاگ چکے تھے۔ بہت سوں نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اس جنگ میں تین ہزار مجاہدین نے جامِ شہادت نوش کیا۔

یہ اُندلس میں مسلمانوں کی کامیابیوں کا شاندار آغاز تھا۔ اس کے بعد مسلمانوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ فرانس اور پرتگال کی سرزمین میں داخل ہو گئے، یہاں تک کہ خلیفہ وقت نے مزید فتوحات سے روک دیا۔ اندلس پر مسلمانوں کی شان و شوکت کا سورج ساڑھے سات سو سال تک چمکتا رہا۔ یورپ نے جدید علوم اور انسانی تہذیب کے اصول قرطبہ اور غرناطہ کی درس گاہوں سے حاصل کیے۔ اندلس میں مسلمانوں کی عظمت کا سہرا طارق بن زیاد کے سر ہے جن کی بے مثال فراست و شجاعت آج کے نوجوانوں کے لیے نشانِ راہ ہے۔

☆......☆

انتقال پر ملال

بچوں کے معروف شاعر ضیاء الحسن ضیا کی رفیقہ حیات کا قضائے الٰہی سے انتقال ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحومہ کی مغفرت فرمائے۔ (آمین)

آم کے شوقین

ایک بار آخری مغل بادشاہ، بہادر شاہ ظفر باغ کی سیر فرمارہے تھے۔ مرزا غالب بھی ہمراہ تھے جو پُر تجسس نظروں سے آم کے درختوں کو دیکھ رہے تھے۔ بادشاہ نے پوچھا: ''مرزا صاحب! آپ درختوں کو گہری نظروں سے کیوں دیکھ رہے ہیں؟'' مرزا گویا ہوئے: ''میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ جو شے جسے ملنی ہو اُس کے دانے دانے پر اسی کے نام کی مہر لگی ہوتی ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ کسی پر میرے نام کی مہر بھی لگی ہے یا نہیں؟''

یہ سن کر بہادر شاہ ظفر مسکرائے اور مرزا صاحب کا مدعا سمجھ گئے۔ اُنھوں نے آموں کی ایک ٹوکری مرزا صاحب کو بطور تحفہ بھجوائی۔

اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا غالب کو آم سے کتنی رغبت تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بیسویں صدی میں اردو کے عظیم ترین شاعر علامہ اقبال بھی آموں کے شوقین تھے۔ نوجوانی میں آپ کا دستور تھا کہ آموں کی دعوتوں میں شریک ہوتے۔ ان دعوتوں میں اہل لاہور سیروں آم کھا جاتے تھے۔ مرزا غالب کے بقول آم میں دو خصوصیات ہونی چاہییں: ''اوّل وہ میٹھے ہوں، دوم بہ کثرت ہوں۔

مرسلہ: یوسف منیر

اہلِ کشمیر کے نام

مایوس نہ ہو

مظفر وارثی

مایوس نہ ہو
وہ دیکھ چمکتی راہ گزر
کرنا ہے تجھے ہمت کا سفر
فولاد کا دل رکھ سینے میں
آئے گا مزہ پھر جینے میں
دریا کو چمن کو صحرا کو
قدموں میں جھکا لے دنیا کو
مشہور جہاں ہو تیرا چلن
یوں جھوم کے چل رستے کی تھکن
محسوس نہ ہو
مایوس نہ ہو

سچائی ہو معیار ترا
آئینہ ہو کردار ترا
جذبوں کی حرارت سرد نہ ہو
ماتھے پہ لہو ہو گرد نہ ہو
آہٹ سے تری پتھر جاگے
امروز ہو فردا سے آگے
رکھ دے انگارے پھولوں میں
روشن کر شمع بگولوں میں،
فانوس نہ ہو
مایوس نہ ہو

نکلیں جو لوگ تیقّن سے
خود کترائے مشکل اُن سے
دُکھ میں بھی ہنستے رہنا ہے
یہ دل والوں کا گہنا ہے
بھرنے ہیں دھوئیں میں رنگ تجھے
کرنی ہے ہوا سے جنگ تجھے
اِحرام زِرَہ سے ڈھانپ بدن
کمخواب وزَری کا جانِ وطن
ملبوس نہ ہو
مایوس نہ ہو

سناٹے نغمہ بار ہیں
نیندیں تیری بیدار ہیں
بیداری دیکھے سپنا بھی
کرنا ہے تعاقب اپنا بھی
اُجلا نہ ہو چاہے باہر سے
ہر سانس ہو روشن اندر سے
یہ روشنی ہے رستہ بھی ترا
اس رستے میں سایہ بھی ترا
جاسوس نہ ہو
مایوس نہ ہو

برصغیر کے طویل المدت حکمران

برصغیر (پاکستان، بنگلہ دیش، بھارت) پر مسلمانوں نے ۸۵۰ سال بڑی شان سے حکومت کی ہے۔ بادشاہوں کے زمانے کا یہ سنہری دور پاک و ہند کی تاریخ کا ناقابل فراموش عہد ہے۔ پہلے نمبر پر سب سے لمبے عرصے یعنی ۴۹ سال تک شہنشاہ جلال الدین اکبر نے حکومت کی۔ یہ مسلمانوں کا مغل دور حکومت تھا۔ ۲۶ سال چار ماہ تک خاندان غلاماں کے سلطان شمس الدین التمش نے حکومت کی اور دوسرے نمبر پر رہے۔ تیسرا نمبر خلجی سلطنت کے بادشاہ سلطان علاؤالدین خلجی کا ہے جس نے ۲۰ سال اور ۲۷ دن تک حکمرانی کی۔

یاٹ

یاٹ (Yacht) کو عام اردو میں بادبانی کشتی بھی کہتے ہیں۔ اس نوع کی کشتی انسان نے اپنے ابتدائی دور میں ہی تیار کرلی تھی۔ کھمبوں پر ایک ترتیب سے بندھے گئے مضبوط کپڑے یاٹ کی اصل پہچان ہیں۔ ہوا ان پردوں سے ٹکرا کر کشتی کو آگے کی جانب دھکیلتی ہے۔ اس طرح اسے چلانے کے لیے کسی مشین یا چپو کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔ مگر جب ہوا رک جائے تو یہ بھی رک جائے گی۔ تصویر میں جو یاٹ آپ دیکھ رہے ہیں بالکل اسی طرح کی یاٹ میں ایک برطانوی لڑکے رابن نے صرف ۱۶ برس کی عمر میں ساتوں براعظموں کے گرد چکر کاٹا تھا۔

تاج المساجد

ہندوستان میں مسلم تہذیب کے مراکز میں دہلی، لکھنؤ، حیدرآباد کے بعد کسی شہر کا نام آتا ہے تو وہ وسط ہند کا اہم شہر بھوپال ہے، جو رقبے کے لحاظ سے ملک کی سب سے بڑی ریاست مدھیہ پردیش کا دارالحکومت بھی ہے۔ قدرتی نشیب و فراز سے آراستہ یہ شہر چار نسلوں تک بیگمات کی حکمرانی اور ان کی تعمیر کی گئی مساجد کی وجہ سے جانا جاتا ہے، لیکن جس مسجد نے اس شہر کو پوری دنیا میں شہرت بخشی، وہ تاج المساجد ہے، جو برصغیر کی چار عظیم الشان مساجد میں شمار ہوتی ہے۔ تاج المساجد کا سنگ بنیاد ریاست کی تیسری خاتون فرمانروا خلد مکانی نواب شاہ جہاں بیگم نے ۱۸۸۶ء میں رکھا۔ شاہ جہاں بیگم بھوپال کی وہ خاتون حکمران ہیں جنھیں اپنے ہم نام مغل بادشاہ شاہجہاں کی طرح عمارت سازی کا بڑا شوق تھا۔ ان کے اس تعمیری ذوق کا ثبوت تاج محل، عالی منزل، بے نظیر، گلشن عالم جیسی منفرد عمارتیں ہیں اور ان میں سب سے نمایاں تاج المساجد ہے، جس کی تعمیر کے لیے بیگم صاحبہ نے اپنے خزانے کا منھ کھول دیا تھا۔ بیسویں صدی آتے آتے ۱۹۰۱ء میں شاہجہاں بیگم کی وفات ہوگئی اور وہ مسجد کو مکمل کرنے کی حسرت دل میں لیے دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ انھوں نے تاج المساجد کے لیے بلور کے مصلے، کلس، فوارے اور زنانہ حصے کے لیے

بلوری فرنیچر منگوایا تھا جو سب کرسٹل کٹ تھا۔ بیگم صاحبہ کی یہ آرزو تھی کہ مسجد کی تعمیر مکمل ہونے پر رسم افتتاح کی تقریب منعقد ہو تو اس میں تعمیری کام انجام دینے والے سارے عملے (کاریگر اور مزدور وغیرہ) کو دو دو ماہ کی اجرت نقدی کی صورت میں اور اتنی ہی قیمت کے جوڑے پیڑے تقسیم کیے جائیں اور اس کے لیے ہزاروں کی تعداد میں اطلس، کمخواب اور مشروع کے تھان خرید کر توشہ خانے میں جمع کر لیے گئے تھے لیکن بیگم صاحبہ کی آنکھیں بند ہوتے ہی مسجد کا کام رک گیا۔ اس کے خارجی میدان میں پڑے ہوئے تراشیدہ پتھر منتظر رہے کہ مسجد کی تعمیر میں ان کا استعمال ہو۔

پورے پچاس سال بعد ۱۹۵۰ء میں مولانا محمد عمران خاں ندوی تاج المساجد کی تعمیر میں مصروف ہو گئے۔ یہاں تک کہ ۱۹۸۶ء میں اصحاب خیر کے تعاون سے مسجد تکمیل کو پہنچی۔ چھتیس سال کی شب و روز محنت، ہزاروں کاریگروں اور مزدوروں کی مشقت، لاکھوں بندگان خدا کے مالی تعاون اور ہزاروں اہل اللہ کی دعاؤں کے طفیل دو کروڑ کے سرمایے سے قدیم وجدید فن تعمیر کا یہ پروجیکٹ مکمل ہوا۔ اس کی تعمیر میں جہاں مساجد کے تمام روایتی خدوخال کا لحاظ رکھا گیا وہیں اس کی ہیئت کو دلکش بنانے کی بھی پوری کوشش کی گئی۔ مسجد کے مرکزی ہال یعنی جماعت خانے کا رقبہ تقریباً ۲۴ ہزار مربع فٹ، جبکہ چھت اس کے تین گنا حصے پر پھیلا ہوا ہے، ہر مینار کی بلندی ۲۰۶ فٹ اور قطر تقریباً ۲۸ فٹ ہے اور گنبد ۴۰ فٹ پر محیط ہیں۔ مسجد کے شمال اور جنوب میں پتھروں کی خوبصورت جالیوں سے آراستہ پردہ نشین خواتین کے لیے دو علیحدہ حصے بھی تعمیر کیے گئے ہیں جو سنگ تراشی کا شاہکار کہے جا سکتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی تاج المساجد آج ایشیا کی مایہ ناز مسجد ہی نہیں اپنے بانی اور معمار کے حوصلے، نیز فن تعمیر کے شاہکار کا درجہ بھی رکھتی ہے۔ اگر مسجد اس کے معمار اول کے حوصلے کے مطابق مکمل ہو جاتی تو یقیناً دنیا میں اپنی مثال آپ ہوتی۔

آخری پتا
ماریہ سمجھ رہی تھی اگر انگور کی بیل کا آخری پتا گر گیا
تو وہ بھی نہیں بچے گی

مغربی واشنگٹن کے مضافات میں کچھ تنگ و تاریک محلے ایسے بھی ہیں جہاں شہر کی غریب آبادی رہائش پذیر ہے۔ آبادی کا زیادہ تر حصہ مصوروں اور دیگر فنون لطیفہ سے وابستہ افراد پر مشتمل ہے۔ ایسے ہی دو کمرے کے ایک فلیٹ میں دو سہیلیاں رہتی تھیں۔ دونوں ہی اچھی مصور تھیں۔

یہ ماہ نومبر تھا جب ایک اجنبی، سرد مہر مہمان کالونی میں داخل ہوا جسے ڈاکٹرز نمونیہ کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ نمونیہ اپنی برفیلی انگلیوں سے کبھی کسی کو اور کبھی کسی کو چھوتا رہا یہاں تک کہ بدقسمتی سے ایک دن ماریہ بھی نمونیے کا شکار ہوگئی۔ مرض اپنی شدت پر تھا اور وہ بالکل بستر سے لگ گئی تھی۔ وہ ہر وقت کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکتی رہتی تھی جو گھر کے پچھلے حصے میں کھلتی تھی۔

ایک صبح معروف ڈاکٹر نے سونی کو بلایا اور کہنے لگے:

''مریض کے پاس صرف ایک فی صد چانس ہے اور وہ بھی اس صورت میں اگر وہ خود جینا چاہے، ورنہ وہ مرجائے گی۔ وہ صرف قوت ارادی کے بل پر تندرست ہوسکتی ہے۔ مگر آپ کی ننھی دوست نے اپنا ذہن بنا لیا ہے کہ وہ ٹھیک نہیں ہوسکتی۔ شاید یہ ذہنی کمزوری کے باعث ہے۔ میں اپنی طرف سے تو پوری کوشش کر رہا ہوں کہ مریضہ ٹھیک ہوجائے لیکن جب میرا مریض اپنے جنازے میں شریک ہونے والے افراد کی تعداد گننا شروع کردے تو میں اپنی دوا کی تاثیر میں سے پچاس فیصد منہا (کمی) کردیتا ہوں۔''

ڈاکٹر کے جانے کے بعد سونی، ماریہ کے کمرے میں گئی۔ وہ اپنے بستر میں بے حس و حرکت پڑی تھی۔ اس کا چہرہ کھڑکی کی طرف تھا۔ سونی کو لگا جیسے وہ سو رہی ہو۔ اس نے اپنا ڈرائنگ بورڈ اُٹھا کر اپنا کام کرنا شروع کردیا۔ اسے ایک رسالے کی کہانیوں کے اسکیچ بنانے کا کام ملا تھا۔ ابھی وہ اپنے کام میں مصروف ہی تھی کہ اچانک اسے ایک دھیمی آواز سنائی دی۔ وہ جلدی سے اُٹھ کر ماریہ کے بستر کے پاس گئی۔ ماریہ کی آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی تھیں۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی اور اُلٹی گنتی گن رہی تھی۔ ''بارہ'' اس نے کہا۔ پھر تھوڑی دیر بعد ''گیارہ''، پھر ''دس''، ''نو''، ''آٹھ''، ''سات'' جلدی جلدی گنے۔ سونی نے تشویش زدہ نظروں سے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ وہاں گنتی گننے کے لیے تھا ہی کیا؟ صرف ایک خالی اُجاڑ صحن اور گھر کی پچھلی دیوار جس پر انگور کی ایک بہت پرانی بیل لپٹی ہوئی نظر آرہی تھی۔ خزاں کی ٹھنڈی سانس نے انگور کی بیل کے قریب قریب سارے ہی پتے جھاڑ دیے تھے اور اب تقریباً گنجی بیل دیوار سے لپٹی نظر آرہی تھی۔

''تم کیا گن رہی ہو ڈیئر؟'' سونی نے پوچھا۔

''چھے۔'' ماریہ نے تقریباً سرگوشی میں کہا۔ ''وہ اب

پہلے کے مقابلے میں اور بھی تیزی سے گر رہے تھے۔ تین دن پہلے وہ تقریباً سو کے لگ بھگ تھے۔ ان کو گنتے گنتے میرے سر میں درد شروع ہو جاتا تھا۔ لیکن اب یہ آسان ہے۔ یہ ایک اور گرا۔ اب صرف پانچ رہ گئے ہیں۔"

"پانچ کیا میری دوست؟ مجھے نہیں بتاؤ گی؟" سونی نے پیار سے پوچھا۔

"انگور کی بیل کے پتے! جب آخری پتا گر جائے گا تو میں بھی مر جاؤں گی۔ مجھے یہ بات پچھلے تین دن سے معلوم ہے۔ کیا تمھیں ڈاکٹر نے نہیں بتایا؟"

"میں نے آج تک ایسی احمقانہ بات نہیں سنی!" سونی نے غصے سے کہا۔ "بھلا انگور کی بیل کے پتوں کا تمھارے صحت یاب ہونے سے کیا تعلق ہے؟ اور تم کو تو یہ بیل بہت پسند تھی بے وقوف لڑکی! اب سوپ پیو اور مجھے اپنا کام مکمل کرنے دو تاکہ میں رسالے سے اپنا معاوضہ حاصل کر کے اپنی پیاری دوست کے لیے کچھ پھل اور اپنے لیے چرغہ خرید سکوں۔"

"اب تمھیں میرے لیے مزید پھل خریدنے کی ضرورت نہیں۔" ماریہ نے کہا، اس کی آنکھیں ابھی بھی کھڑکی سے باہر جمی ہوئی تھیں۔ "ایک اور گرا۔ نہیں، مجھے سوپ کی بھی ضرورت نہیں، اب صرف چار پتے رہ گئے ہیں۔ میں اندھیرا ہونے سے پہلے، پہلے آخری پتے کو گرتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہوں۔ پھر میں خود بھی یہاں سے ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جاؤں گی۔"

"ماریہ ڈیئر!" سونی نے اس پر جھکتے ہوئے کہا۔ "کیا تم وعدہ کرو گی کہ جب تک میں اپنا کام مکمل نہ کرلوں، تم اپنی آنکھیں بند رکھو گی اور کھڑکی سے باہر نہیں دیکھو گی۔ مجھے یہ کام مکمل کر کے ہر حال میں کل ایڈیٹر کو دینا ہے۔ مجھے روشنی کی ضرورت ہے ورنہ میں کھڑکی کا پردہ گرا دیتی۔"

"کیا تم دوسرے کمرے میں جا کر اپنا کام نہیں کر سکتیں؟" ماریہ نے سرد مہری سے پوچھا۔

"نہیں! میں تمھیں یہاں اکیلے نہیں چھوڑنا چاہتی اور نہ ہی میں یہ چاہتی ہوں کہ تم اس طرح باہر انگور کی بیل کو تکتی رہو۔"

"اچھا! تو جیسے ہی اپنا کام ختم کرلو، مجھے بتا دینا۔" ماریہ نے اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا اور سیدھا ہو کر لیٹ گئی۔ وہ کسی مردے کی طرح سفید اور بے حس و حرکت نظر آ رہی تھی۔

"کیونکہ میں آخری پتے کو گرتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں انتظار کرتے، کرتے تھک چکی ہوں۔ میں سوچتے سوچتے تھک چکی ہوں۔ میں زندگی کو تھامے رہنے سے تھک چکی ہوں۔ میں ان غریب پتوں کی طرح خاموشی سے گر جانا چاہتی ہوں، سب کچھ چھوڑ دینا چاہتی ہوں۔"

''تم سونے کی کوشش کرو۔'' سونی نے کہا۔
''مجھے پڑوس سے بوڑھے برمن کو بلانے جانا ہے۔ مجھے ایک کان کن کا خاکہ بنانا ہے جس کے لیے برمن سے بہتر ماڈل اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ اپنی جگہ سے ہلنے کی بھی کوشش نہیں کرنا، میں دس منٹ میں آتی ہوں۔''

بوڑھا برمن بھی ایک مصور تھا جو نیچے والے فلیٹ میں رہتا تھا۔ اس کی عمر ساٹھ سال سے اوپر ہوچکی تھی۔ وہ ہمیشہ ایک ماسٹر پیس بنانے کی کوششوں میں مصروف رہا لیکن ابھی تک وہ اپنی ان کوششوں میں ناکام رہا تھا اور اب محض سائن بورڈ پینٹ کرنے کا کام کرکے اپنی روزی کمار ہا تھا۔ کچھ پیسے وہ کالونی میں رہنے والے نوجوان مصوروں کے لیے ماڈل بن کر کما لیتا تھا جو اچھے اور پیشہ ور ماڈل کی فیس ادا نہیں کرسکتے تھے۔ اس کے باوجود وہ ہر کسی سے اپنے خوابوں کی اس شاہ کار پینٹنگ کے بارے میں باتیں کرتا رہتا تھا جو اس نے ابھی بنانی ہی شروع نہیں کی تھی۔ سونی جب برمن کو بلانے گئی تو وہ کھانس رہا تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں خالی کینوس پچھلے پچیس سال سے شاہ کار تصویر کے انتظار میں ٹنگا ہوا تھا۔ سونی نے اسے ماریہ کی طبیعت اور عجیب وغریب خیالات کے بارے میں بتایا۔ وہ خوف زدہ تھی کہ ماریہ جو خود ایک سوکھے پتے کی طرح کمزور اور ہلکی پھلکی ہوچکی ہے، کہیں واقعی ایک پتے کی طرح اپنی گرفت دنیا سے کھو نہ بیٹھے۔

بوڑھے برمن کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ''یہ کیسی حماقت انگیز سوچ ہے؟ کیسے بے وقوفانہ خیالات ہیں؟'' وہ چلایا۔
''کیا دنیا میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اپنی زندگی کو کسی خزاں رسیدہ بیل کے پتے گرنے سے وابستہ کر لیتے ہیں؟ تمھاری دوست احمق ہے جاؤ جا کر اپنی احمق دوست کی تیمارداری کرو۔''
''وہ بیمار اور کمزور ہے اور بخار نے اس کی سوچوں کو بھی بیمار اور کمزور بنا دیا ہے اور مسٹر برمن۔'' سونی نے برا مانتے ہوئے کہا۔
''اگر آپ میرے لیے کام نہیں کرنا چاہتے تو آپ کو زحمت کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ مگر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ آپ ایک سخت دل انسان ہیں۔ کالونی کے لوگ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔''
''اور دنیا کے سب لوگ بھی بالکل ٹھیک کہتے ہیں کہ ساری لڑکیاں جلد باز اور احمق ہوتی ہیں۔'' برمن چلایا۔
''میں نے یہ کب کہا کہ میں مدد نہیں کروں گا۔ میں چل رہا ہوں۔ میں تو ماریہ بیٹی کے بیمار ہونے کی وجہ سے پریشان ہوگیا تھا۔ مگر یاد رکھنا، میں کسی نہ کسی دن اپنا شاہکار ضرور بناؤں گا۔ ہم سب اپنے مصور کا شاہکار ہیں اور ایک دن اس کے پاس لوٹ جائیں

گے۔ کیا سمجھیں؟ اب چلو!''

جب وہ دونوں اوپر پہنچے تو ماریہ سو چکی تھی۔ سونی نے کھڑکی کا پردہ نیچے گرا دیا اور برمن کو اشارے سے دوسرے کمرے میں لے گئی۔

دوسرے کمرے کی کھڑکی سے وہ دونوں خوف زدہ نظروں سے انگور کی ٹنڈ منڈ بیل کو دیکھتے رہے اور پھر خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ باہر اچانک تیز بارش شروع ہو گئی تھی۔ تیز ہواؤں کے جھکڑ سنتے، سنتے، سونی نے برمن کی تصویر بطور ماڈل بنانا شروع کر دی۔

اگلے دن جب سونی سو کر اٹھی تو ماریہ کو جاگتے پایا۔ وہ کھڑکی کے گہرے سبز پردے کو خالی خالی نظروں سے گھور رہی تھی۔ ''پردہ ہٹا دو۔ میں باہر دیکھنا چاہتی ہوں۔'' اس نے نحیف آواز میں حکم دیا۔

سونی نے جھجکتے ہوئے پردہ ہٹا دیا۔

مگر اوہ! ساری رات طوفانی بارش اور خوف ناک ہواؤں کے جھکڑ چلنے کے باوجود بھی انگور کی بیل پر ایک پتا موجود تھا۔ یہ بیل کا آخری پتا تھا۔ بیچ میں سے زرد مگر کناروں سے ابھی تک سبز یہ بہادر پتا زمین سے تقریباً بیس فٹ اوپر دیوار پر لپٹی بیل پر موجود تھا۔ ''یہ آخری ہے۔'' ماریہ نے کہا۔ ''میرا خیال تھا کہ رات کو یہ بھی گر چکا ہوگا۔ میں کل تیز ہواؤں کی آواز سن رہی تھی۔ خیر! اب یہ آج گر جائے گا اور میں بھی اس کے ساتھ ہی مر جاؤں گی۔''

''ڈیئر!'' سونی نے تھکی تھکی آواز میں کہا۔

''اگر تمھیں اپنا خیال نہیں ہے تو میرا ہی کچھ خیال کرو۔ میرا کیا بنے گا؟'' مگر ماریہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دنیا میں سب سے اکیلا وہ شخص ہے جو خود کو ایک پراسرار، دور دراز سفر پر جانے کے لیے تیار کر رہا ہو۔ یہ عجیب و غریب خیال اس پر اپنی گرفت اتنی ہی تیزی سے مضبوط کر رہا تھا جتنی تیزی سے ایک ایک کر کے دوستی اور دیگر تمام دنیاوی بندھنوں پر سے اس کی گرفت کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ دن آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ سورج غروب ہوتے وقت بھی دھندلی روشنی میں وہ دونوں آخری پتے کو بیل سے لپٹے ہوئے دیکھ سکتی تھیں اور پھر رات کو طوفانی ہوائیں دوبارہ چلنا شروع ہو گئیں۔ تیز بارش رات بھر جاری رہی۔

جیسے ہی صبح کی روشنی پھیلنا شروع ہوئی، ماریہ نے بے رحمی سے پردہ ہٹانے کا حکم دیا۔ آخری پتا اب بھی وہاں موجود تھا۔

ماریہ کافی دیر تک اسے دیکھتی رہی اور پھر اس نے سونی کو آواز دی جو کچن میں اس کے لیے سوپ بنا رہی تھی۔ ''میں بہت بری ہوں سونی۔'' ماریہ نے کہا۔ ''کسی غیبی طاقت نے اس پتے کو بیل پر اس لیے موجود رہنے دیا تا کہ میں جان سکوں کہ میں کتنی

بُری، خودغرض اور کمزور اعتقاد کی ناشکری لڑکی ہوں۔ مرنے کی خواہش کرنا گناہ ہے۔ خدا کی ذات سے مایوسی کفر ہے۔ مجھے کچھ سوپ پینے کے لیے دو اور تھوڑا دودھ بھی دلیے کے ساتھ بلکہ نہیں، پہلے مجھے ایک چھوٹا آئینہ لا کر دو تا کہ میں اپنا حلیہ درست کرسکوں اور مجھے تکیے کے ساتھ سہارا دے کر بٹھا دو۔"

دوپہر میں ڈاکٹر آیا۔ جب وہ معائنہ کر کے جانے لگا تو سونی سے کہا۔

"خدمت اور محبت سے زندگی کا چانس بڑھایا جاسکتا ہے۔ ماریہ بہت جلد ٹھیک ہوجائے گی۔ وہ پھر سے جینا چاہتی ہے۔ اب مجھے اجازت دیں مجھے آپ کے نیچے والے فلیٹ میں ایک مریض کو دیکھنے جانا ہے۔ اس کا نام برمن ہے اور غالباً وہ بھی کوئی آرٹسٹ ہے۔ اس کو نمونیہ ہوگیا ہے۔ وہ ایک بوڑھا اور کمزور انسان ہے اور نمونیہ کا حملہ بہت شدید ہے۔ اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں ہے لیکن آج ہم اسے ہسپتال بھیج دیں گے تا کہ شاید کچھ بہتری ہوجائے۔"

اگلے دن ڈاکٹر نے سونی سے کہا۔"ماریہ کی حالت خطرے سے باہر ہے آپ جیت گئیں۔ خوراک اور دیکھ بھال۔ اب صرف یہی کافی ہے۔"

اور اس دوپہر سونی، ماریہ کے پاس آئی جو اُونی اسکارف بُننے میں مصروف تھی۔ سونی نے ماریہ کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا۔"میں تمھیں کچھ بتانا چاہتی ہوں میری ننھی دوست!" اس کی آواز مدھم ہوگئی۔

"مسٹر برمن نمونیے کے حملے کی وجہ سے آج ہسپتال میں انتقال کر گئے۔ وہ صرف دو دن بیمار رہے۔ دو روز قبل عمارت کے جمعدار نے انھیں اپنے فلیٹ کی سیڑھیوں پر گرے ہوئے پایا تھا۔ وہ درد سے بے قرار تھے۔ ان کے کپڑے اور جوتے گیلے اور برف سے زیادہ ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ عمارت کے لوگوں کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایسی طوفانی بارش والی رات میں کہاں تھے اور کیا کر رہے تھے اور پھر ان لوگوں کو ایک لالٹین ملی جو اس وقت بھی جل رہی تھی اور لکڑی کی ایک سیڑھی جو اپنی جگہ سے ہٹی ہوئی تھی اور کچھ پینٹ برش جو بکھرے ہوئے تھے اور رنگوں کی تختی بھی جس میں سبز اور زرد رنگ گھولا گیا تھا۔ کھڑکی سے باہر جھانکو میری دوست! بیل کے اس آخری پتے کو دیکھو، کیا تم کو کبھی یہ سوچ کر حیرت نہیں ہوئی کہ آخر یہ پتا ہوا سے حرکت کیوں نہیں کرتا؟ آہ! میری پیاری دوست! یہ برمن کا شاہکار ہے۔ اس نے یہ پتا دیوار پر بیل کے ساتھ اس طوفانی رات پینٹ کیا تھا جس رات اس بیل کا آخری پتا گر گیا تھا۔"

☆......☆
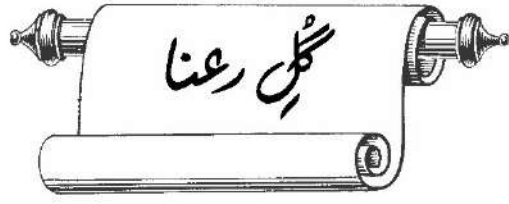
گل رعنا اپنی چھ بہنوں میں سب سے چھوٹی ہیں...... مگر صلاحیت میں کسی سے کم نہیں۔ اُنھوں نے اپنے لیے 'ترجمہ' کی صنف چنی ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ انہیں 'انگریزی' پڑھنی آتی ہے۔ 'ساتھی' کے ساتھیوں کا کہنا ہے کہ ان کے ترجمہ میں جو روانی ہے وہ صرف پانی کے بہاؤ میں ہی نظر آتی ہے۔ اگر بہت دن تک ان کی تحریر قارئین کو نظر نہ آئے تو جان لیں کہ وہ بہت دنوں سے 'فریئر ہال' یا کسی بک فیئر نہیں گئیں۔ وہیں سے وہ اچھی اچھی کتابیں خریدتی ہیں اور پھر ان میں سے ترجمہ کے لیے تحریر منتخب کرتی ہیں۔ یہ 'انتخاب' عموماً چھوٹے اور معصوم بچوں کے لیے ہوتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ چھوٹے بچے اِنھیں پسند ہیں اگر وہ بڑے نہ ہو جائیں۔ گل کے پسندیدہ کردار، پری، بونے اور بھولے بھالے جانور ہیں۔
کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ دیکھنے میں چینی جاپانی لگتی ہیں مگر یقین جانیے کہ پاکستانی ہیں اور وہ بھی سچی پاکستانی! ان کے والد اِنھیں اس وقت تک ہمدرد نونہال (رسالہ) دلاتے رہے جب تک وہ یونی ورسٹی میں نہیں پہنچ گئیں۔ کراچی یونی ورسٹی سے اُنھوں نے 'ایم کام' کیا اور پھر وہ 'اسٹینڈ ڈ چارٹر بینک' سے منسلک ہوگئیں۔ اس کے باوجود بینک کا نام بدستور اسٹینڈر چارٹر ہی رہا...... ہے نا مزے کی بات!
کچھ لوگوں نے یہ شبہ ظاہر کیا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سب ہی بہنیں لکھنے لکھانے کی صلاحیت رکھتی ہوں۔ ضرور کوئی ایک 'بہن' ہے جو سب کے نام سے باری باری لکھتی ہے گویا وہ بہن 'رائٹر' نہیں 'پرنٹر' ہوگئی جو اس رفتار سے دھڑا دھڑ سب کے نام سے تحریریں منظرِ عام پہ لا رہی ہو۔ بہر حال ہم ان لوگوں کو بتاتے ہیں کہ بات کچھ یوں کہ صدیقی سسٹرز کے نانا مرحوم 'سید محبّ الحق (محشؔر)' ہندوستان کے بہت اچھے مصنف تھے اور مزاح پہ مبنی تحریریں لکھتے تھے۔ گویا ان سب بہنوں میں اگر کوئی صلاحیت ہے تو وہ اللہ کی مہربانی، والدین کی بے پناہ حوصلہ افزائی کے بعد نانا مرحوم کی مرہونِ منت ہے۔ چونکہ 'نانا' ایک ہیں لہٰذا سب بہنوں کا لکھنے کا انداز بھی ملتا جلتا ہے۔
گل رعنا ایک کم گو اور سنجیدہ طبع شخصیت کی مالک ہیں۔ مذہب سے گہرا لگاؤ ہے۔ گل رعنا عموماً شکایت نہیں کرتیں۔ ہاں اگر کوئی بات بُری لگ جائے تو ناراض ہو جاتی ہیں اور بہت دیر تک خاموش رہتی ہیں۔ بڑوں کو جواب دینا کوئی اچھی بات نہیں مگر گل رعنا جواب نہ دینے کا کام اس وقت کرتی ہیں جب خفا ہوں۔ گو لڑائی جھگڑے اور شکوے شکایت سے دور رہتی ہیں مگر 'ساتھی' سے انہیں ایک شکایت ہوگئی ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ زندگی میں انہیں ایک اکیلا 'ساتھی ایوارڈ' ملا تھا جو ان تک نہیں پہنچا۔ اب وہ کم از کم اس وقت تک 'ساتھی' کے لیے لکھتی رہیں گی جب تک ان کو کوئی ایوارڈ نہ مل جائے۔ ویسے نومبر میں ہونے والی تقریب میں وہ ایک اور ایوارڈ سے بھی نوازی گئی ہیں۔

معلوماتی ہے۔ سکھر اور روہڑی تو کئی بار جانا ہوا لیکن
اس مسجد اور اس کی خصوصی اہمیت سولنگی کے ذریعے
معلوم ہوئی، شکریہ۔ ام سلمٰی کا نام ام مسلمہ (صفحہ ۲۷)
غالباً کمپوزنگ کا سہو ہے۔ ماہم جاوید کی پیاری اسماء
خالہ مزے کی ہے۔ (خالہ نہیں کہانی) صدقے کی
اہمیت اور افادیت بڑے دلچسپ انداز میں سمجھا دی
ہے۔ اب اتنی اچھی کہانی میں کوئی غلطی تلاش کرنا تو
زیادتی ہے۔ بس یوں ہے کہ پردادی کی مسہری (صفحہ
۳۲) اچانک مذکر ہوگئی یعنی ''حصے میں آیا۔ ہلکا سا ہلتا
رہتا تھا'' مسہری ۵۰ سال کی ہو تو بھی مونث ہی رہتی
ہے۔

لطیفوں میں پہلا ہی لطیفہ اس میں حیدرآباد کی ماہ رخ
طے نہیں کر پائیں کہ ان کا توتا 'ت' سے ہے یا 'ط'
سے۔ احتیاطاً دونوں ہی دے دیے ہیں، جسے جو پسند
آئے یا جس کا توتا جیسا ہو۔ فقیر والا لطیفہ بھی مزے کا
ہے بس یوں ہے کہ ''کم بختوں'' میں نون غنہ نہ ہوتا تو
اچھا تھا۔ شاید یہ بات پہلے بھی کہی یا لکھی جا چکی ہے کہ
جب کسی کو پکارا جائے، آواز دی جائے یا حرف ندا ہو
اس میں نون غنہ نہیں آتا جیسے اے لوگو، اے انسانو،
اے آدمیو اور اے کمبختو۔

فاطمہ نور صدیقی نے پراسرار قلعہ (قَلْعَہ) میں آخری
وقت تک قید رکھا۔ قَلْعَہ پر اعراب اس لیے لگا دیے
ہیں کہ کچھ لوگ قلعہ کو زیر کر لیتے ہیں۔ یعنی ق کے نیچے
زیر (کسرہ) لگا کر بولتے ہیں۔ جب کہ یہ ''قَلْعَہ''
ہے۔ صفحہ ۵۳ پر ایک جملہ ہے ''ایک بڑے سے پتھر کا
قلعہ موجود تھا۔ کیا پتھر اتنا بڑا تھا یا یہ ''پتھر کا بڑا سا قلعہ
ہے؟ چلیے، خوف کے عالم میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔
''گاؤں نے جمع ہو جانا ہے'' کی ترکیب فصیح نہیں۔
''نے'' کی جگہ ''کو'' استعمال کرنا چاہیے۔ دیکھائی
(ص:۵۷) کا درست املا بغیر ے کے ہے یعنی
''دکھائی''۔ صفحہ ۵۶ پر ''ڈس ڈیئیں'' میں پنجابی میں
دال ہے، ڈال نہیں۔ کہانی کی اٹھان بہت اچھی ہے
لیکن صرف کتاب خانہ دکھانے کے لیے اتنی کھکھیڑ؟
معروف احمد چشتی کا ترجمہ ''ضرورت ہے روم میٹ
کی''۔ دلچسپ تو ہے لیکن چشتی صاحب یہ طے نہیں کر
پائے کہ ''ایلی سن'' لڑکا ہے یا لڑکی۔ ذیلی سرخی اور
ابتدائیے میں ہم اسے لڑکا سمجھتے رہے، تصویر بھی یہی
کہہ رہی تھی لیکن اچانک صفحہ ۸۸ پر ایلی سن اپنے
کھلونوں سے کھیل رہی تھی۔ ایک بار پھر اگلے صفحہ پر
''ایلی سن بتانے لگی''۔ اور ہاں، یہ ٹپوشیاں'' کیا چیز
ہے؟

رابعہ کی جومیٹری چور نصیحت آموز ہے، لیکن یہ لڑکے
جیومیٹری نہیں باکس چرا رہے تھے۔ عرشیہ نوید، غلطی کا
ازالہ کیا جاتا ہے، بھرنا نہیں پڑتا (ص:۱۰۴)۔ فی
الحال اتنا کافی ہے۔

☆......☆

خرگوش کا بچہ

نسرین انجم بھٹی

اتنی دور جو بیٹھا ہے — وہ خرگوش کا بچہ ہے
اس کے پاس جو جاؤ گے — جھک سے آگے بھاگے گا
جھل مل آنکھیں جھپکے گا — دُم کو زمیں پہ پٹکے گا
لمبے لمبے کان ہیں اس کے — روئی جیسے بال ہیں اس کے
ہاتھ کبھی نہ، آئے گا — دور سے دل کو بھائے گا
ادھر سے آتا جاتا ہے — کھیت اُدھیڑے جاتا ہے
بہت سے اس کے بہن اور بھائی — گھسے ہوئے ہیں اندر بھائی
کاٹ کاٹ کے پھینک رہے ہیں — چادر، تکیے، کھیس، رضائی
سیہہ، گلہری اور خرگوش — آپس میں یہ سب ہیں بھائی

پیاری دنیا پیارے لوگ
دھرتی اِن لوگوں نے سجائی

راستہ تلاش کریں

ننھے گھوڑے کو بھوک لگی ہے لیکن سبز سبز پتے کچھ ایسی جگہ پر ہیں جہاں پہنچنا مشکل ہے، گھوڑے کو پتوں تک پہنچائیں کیوں کہ بھوکے کو کھلانے سے اللہ تعالیٰ بہت خوش ہوتے ہیں۔
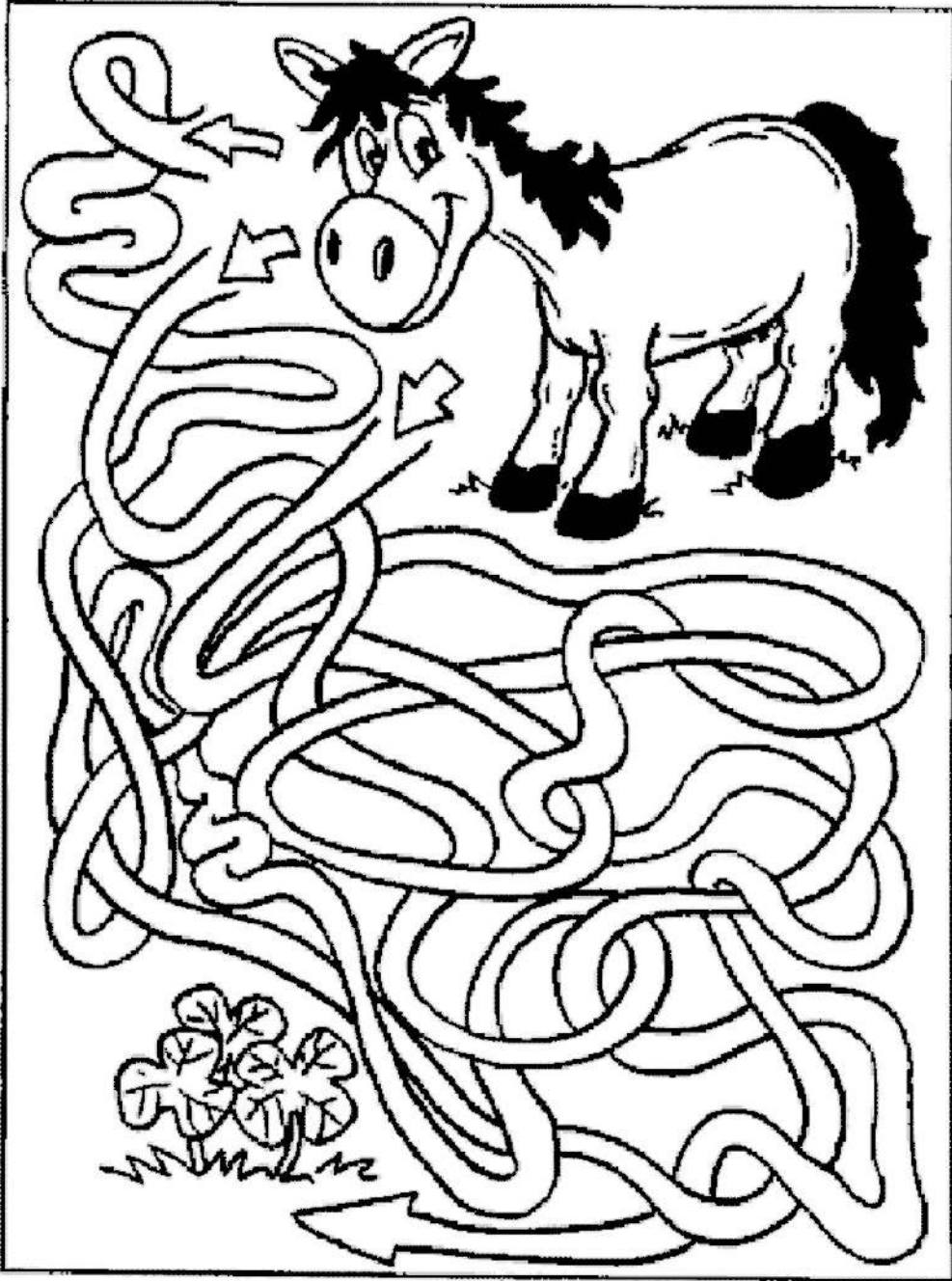
قارئین ساتھی کی حسِ مزاح کو جانچنے کے لیے ماہنامہ ساتھی نے شروع کیا ہے۔ ان کے لیے ایک انعامی سلسلہ۔ جس میں ہر ماہ بہترین اور دلچسپی سے بھرپور لطیفے بھیجنے والے قارئین ساتھی کو **ڈیئر پنسل** اور بال پین بنانے والے ادارے **انڈس پنسل انڈسٹریز** کی جانب سے دیا جائے گا خوبصورت تحفہ......تو پھر قلم سنبھالیے اور مزاح کے اس دوڑ میں شامل ہو جائیں...... جہاں ''ذرا کھلکھلائیے'' آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ نوٹ: لطیفہ روانہ کرتے ہوئے اس پر اپنا نام، مکمل پتا اور فون نمبر لکھنا مت بھولیے گا۔

DEER PENCIL

انتقال

جج (ملزم سے): ''تم نے گاڑی کیوں چوری کی؟''

ملزم: ''جناب! گاڑی قبرستان کے باہر کھڑی تھی۔ میں سمجھا کہ اس کے مالک کا انتقال ہو گیا ہے۔''

مرسلہ: شہنیلا سہیل، کراچی

☆......☆

برتن

ایک گھر میں دال پکی تھی اور مہمانوں کو آنا تھا۔ شوہر نے ایک ترکیب پیش کی جس سے مہمانوں کے سامنے دال پیش کرنے پر شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ پروگرام یہ تھا کہ شوہر دسترخوان پر مہمانوں کو بٹھائے اور تب کچن سے برتن گرنے کی آواز آئے گی اور شوہر پوچھے گا کیا

گرا؟ بیوی کہے گی قورمہ والا برتن گر گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد ایک اور برتن گرے گا اور شوہر پوچھے گا کیا گرا؟ بیوی کہے گی بریانی والا برتن گر گیا۔ طے کردہ پروگرام کے مطابق پہلی بار برتن گرا۔ شوہر نے پوچھا ''کیا گرا؟''

بیوی کی روہانسی آواز آئی: ''دال ہی گر گئی۔''

مرسلہ: کومل فاطمہ اللہ بخش، کراچی

☆......☆

کراچی یا کندھا

ایک شخص پہلی بار کراچی آیا۔ کراچی میں اس نے ایک آدمی کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور پوچھا: ''بھائی، یہ کراچی ہے؟''

آدمی نے غصہ بھرے انداز میں کہا: ''جی نہیں آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے یہ میرا کندھا ہے۔''

مرسلہ: ناہید ضمیر کوسہ، جہان آباد

☆......☆

اچھا......

ایک باپ نے اپنے بیٹے سے کہا: ''بیٹا! تم ایک شیر کے بیٹے ہو؟''

بیٹے نے کہا: ''اچھا تو جبھی کل طاہر مجھے جانور کی اولاد کہہ رہا تھا۔''

مرسلہ: عائشہ خان، کراچی

☆......☆

گول

ایک طالب علم معاشرتی علوم کا پرچہ حل کر رہا تھا۔ جغرافیہ کے حصہ میں سوال تھا: ''بتایئے زمین کیوں گول ہے؟''

طلب علم نے جواب میں لکھا: ''اگر آپ چشمہ لگا کر دیکھیں تو سورج بھی گول ہے۔ چشمہ لگا کر دیکھیں تو چاند بھی گول ہے۔''

ماسٹر صاحب نے پرچہ پر لکھا: ''چشمہ لگا کر دیکھیں نمبر بھی گول ہے۔''

مرسلہ: جویریہ بنتِ حبیب الرحمٰن، کراچی

☆......☆

انعامی لطیفہ

مرد

بچہ باپ سے: ''ابو مرد کسے کہتے ہیں؟''

باپ: ''اُس پاور فل انسان کو جو گھر پر حکومت کرتا ہے۔''

بچہ: ''بڑا ہو کر میں بھی......امی کی طرح مرد بنوں گا۔''

مرسلہ: مکیش رانا، سکھر

☆......☆

نہلے پہ دہلا

ایک کمرہ جماعت میں ڈرائنگ کا پیریڈ ہو رہا تھا۔ استاد نے ایک بچے کو جو ڈرائنگ میں کمزور تھا ڈانٹتے ہوئے کہا: ''جارج واشنگٹن تمھاری عمر میں بڑے اچھے مصور تھے اور تم۔''

بچے نے برجستگی سے جواب دیتے ہوئے کہا: ''سر! سنا ہے جارج واشنگٹن آپ کی عمر میں امریکا کے صدر تھے۔''

مرسلہ: وقار حسن، جیکب آباد

☆......☆

قبر

میڈیسن کا پروفیسر یونیورسٹی کے طلبہ کو لیکچر دے رہا تھا۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ طریقہ علاج ایلوپیتھی ہو، ہومیوپیتھی ہو یا طب یونانی...... کیونکہ سارے راستے ''قبر'' کی طرف ہی جاتے ہیں۔''

مرسلہ: ارسلان خان، لاہور

☆......☆

آگ

شاعر (بیوی سے) ''میں اپنی شاعری سے دنیا بھر میں آگ لگا سکتا ہوں۔''

بیوی: ''تو ایک شعر چولھے میں بھی ڈال دیجیے تا کہ آگ جل جائے۔''

مرسلہ: صدف شمیم، کراچی

☆......☆

کتابیں

چھوٹی بچی وکیل صاحب کے گھر گئی۔ وہاں ڈھیروں کتابیں دیکھ کر وکیل صاحب سے کہا:

''چچا جان! کیا آپ بھی ابو کی طرح لائبریری سے کتابیں لے کر واپس نہیں کرتے؟''

مرسلہ: میثم عباس، کراچی

☆......☆

انعامی لطیفہ

حجام

علی گڑھ یونیورسٹی کے آل انڈیا مشاعرہ میں لکھنو سے ایک حجام کی دکان کے مالک حفیظ سلمانی اسٹیج پر آئے اور کہا۔ ''غزل کی ردیف بھی ہے'' مدنظر رہے مطلع عرض ہے۔

محبت دکھ بھی ہے آرام بھی ہے

ایک طالب علم نے آواز لگائی۔

یہی شاعر یہی حجام بھی ہے

مرسلہ: فاطمہ احمد، لاہور

☆......☆

مشاعرہ

شعر خوانی سے قبل شعرا حضرات کرسیوں پر بیٹھے تھے، مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے یہ فیصلہ ہوا کہ فرشی نشست ہوگی چنانچہ شاعر گوپی ناتھ امن جو کہ مشاعرے کی نظامت کر رہے تھے نے شعرا کو کرسیوں سے فرش پر بلاتے ہوئے کہا۔

''حضرات! اب اہل فن کا زوال ہو رہا ہے۔''

مرسلہ: کامران غازی، کراچی

☆......☆

کرکٹ کے میدان میں کچھ بنتے اور ٹوٹتے ریکارڈز

ٹیسٹ کرکٹ کی سنچریاں

رانا محمد شاھد

جیسے جیسے کرکٹ تیز رفتار ہو رہی ہے ویسے ہی ٹیسٹ کرکٹ میں بھی تیزی نظر آنے لگی ہے۔ یہ تیزی بہت سے نئے ریکارڈز بننے اور پرانے ٹوٹنے کی صورت میں ہمیں نظر آتی ہے۔ موجودہ تیز رفتار کرکٹ میں ٹیسٹ کرکٹ کے کئی ناممکن ریکارڈز ٹوٹ چکے ہیں۔ حال ہی میں پاکستان کے کپتان مصباح الحق نے ٹیسٹ کرکٹ کی تیز ترین نصف سنچری کا ریکارڈ بنا ڈالا اور تیز ترین سنچری بنا کر عظیم کرکٹر ویوین رچرڈز کا ۲۸ سالہ پرانا ریکارڈ برابر کر دیا۔

سابق ویسٹ انڈین کپتان سر ویوین رچرڈز نے ۱۹۸۶ء میں انگلینڈ کے خلاف سینٹ جونز کے میدان میں ۵۶ گیندوں پر ۱۰۳ رنز بنا کر ٹیسٹ کرکٹ کی تیز ترین سنچری کا منفرد ریکارڈ بنایا تھا۔ جسے حال ہی میں پاکستانی کپتان مصباح الحق نے توڑا ہے۔ اس کے بعد آسٹریلوی وکٹ کیپر گلکرسٹ کا نمبر آتا ہے۔ جنھوں نے ۲۰۰۶ء میں پرتھ کے مقام پر انگلینڈ کے

خلاف صرف ۵۷ گیندوں پر سنچری بنائی۔ گلکرسٹ نے انگلش سپنر مونٹی پینسر کے ایک اوور میں ۲۴ رنز بنائے۔ اس کے بعد آسٹریلیا کے ہی جیک گریگری نے صرف ۶۷ گیندوں پر تیز ترین سنچری بنائی تھی۔ اس سنچری کو اس لیے منفرد کہا جاسکتا ہے کہ اُس زمانے میں برق رفتار بلے بازی کا تصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ۱۹۲۱ء میں جوہانسبرگ میں گریگری نے ۲ چھکوں اور ۱۹ چوکوں کے ساتھ ۱۱۹ رنز بنائے۔ اس سنچری کی ایک اور اہم بات یہ ہے کہ جیک گریگری نے اس سنچری کو صرف ۷۰ منٹ میں مکمل کیا جو کرکٹ کی تاریخ میں سب سے کم وقت میں بنائی گئی سنچری ہے اور آج ۹۳ سال بعد بھی یہ ریکارڈ قائم ہے۔

شیونارائن چندرپال نے ویسٹ انڈیز کی جانب سے ۲۰۰۳ء میں ٹیسٹ کرکٹ کی پانچویں تیز ترین سنچری بنائی۔ اُنھوں نے جارج ٹاؤن کے مقام پر ۱۵ چوکوں اور ۲ چھکوں کی مدد سے ۶۹ گیندوں پر سنچری اسکور کی۔ ٹیسٹ کرکٹ کی چھٹی تیز ترین سنچری آسٹریلین اوپنر ڈیوڈ وارنر نے ۲۰۱۲ء میں بھارت کے خلاف اسکور کی۔ اُنھوں نے بھی ۶۹ گیندوں پر ہی یہ اعزاز حاصل کیا۔

ٹیسٹ کرکٹ بنیادی طور پر سست رفتاری سے کھیلی جاتی ہے۔ چونکہ یہ پانچ روزہ کھیل ہے۔ اس لیے عموماً بلے باز آہستہ آہستہ کھیلتے ہیں اور بعض اوقات سنچری کی تکمیل کے لیے پورا پورا دن کریز پر کھڑے رہتے ہیں۔ مگر اب ٹی ٹوئنٹی کرکٹ کے آجانے کے بعد ٹیسٹ کرکٹ میں بھی برق رفتار اننگز نظر آنے لگی ہیں۔ آسٹریلیا کے گراؤنڈ پرتھ کی پچ کو دنیا کی تیز ترین پچ کہا جاتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ٹیسٹ کی دس تیز ترین سنچریوں میں سے ۴ اسی گراؤنڈ میں بنائی گئیں۔ ایڈم گلکرسٹ، ڈیوڈ وارنر، کرس گیل اور رائے فریڈرکس نے اسی پچ پر اپنی تیز ترین سنچریاں اسکور کیں۔

تیز ترین سنچریاں بنانے والوں میں دو پاکستانی بھی شامل ہیں۔ مصباح الحق نے حال ہی میں آسٹریلیا کے خلاف ابوظہبی ٹیسٹ میں تیز ترین سنچری کا ویوین رچرڈز کا ۲۸ سالہ پرانا ریکارڈ برابر کیا۔ دوسرے کھلاڑی سابق کپتان ماجد خان (مائٹی خان) ہیں جنھوں نے نومبر ۱۹۷۶ء میں نیوزی لینڈ کے خلاف کراچی ٹیسٹ میں صرف ۷۴ گیندوں پر سنچری اسکور کی۔ یہ پاکستان کی جانب سے بلے باز کی لنچ سے قبل بنائی جانے والی پہلی ٹیسٹ سنچری کا اعزاز ہے۔ اس ٹیسٹ کا ایک اور منفرد ریکارڈ جاوید میانداد کے پاس ہے، جنھوں نے اسی ٹیسٹ میں "کم عمر ترین ڈبل سنچری بنانے والا" کا اعزاز حاصل کیا۔

خدا کے بعد

عبدالقادر

عبدالقادر عارف صاحب نے اپنی زندگی میں جو آخری تحریر لکھی وہ حمد تھی
قارئین ساتھی کے لیے ان کی آخری حمد پیش خدمت ہے

محمدؐ مصطفیٰ، محبوب داور
خدا کے آخری ہیں وہ پیمبر

جہانوں کے لیے رحمت وہی ہیں
رسولِ ہاشمی ہیں سب سے بہتر

بہت ہیں اُن کے اوصاف حمیدہ
نہیں کوئی بشر اُن کے برابر

جہالت کی مٹائیں ساری رسمیں
وہی ہیں رہنما اور سچے رہبر

قبیلوں نے بہائے خُون کے دریا
بنایا سب کو آپس میں برادر

جو زندہ گاڑتے تھے بیٹیوں کو
بدل کر رکھ دیا اُن کو سَراسَر

معافی آپؐ نے دی دشمنوں کو
پشیماں ہوگئے سارے ستمگر

بچھائے خار جس نے رہگزر پر
عطا اُن کو کیا پھولوں کا بستر

خدا کے بعد ہے درجہ نبیؐ کا
دیا جائے گا اُن کو حوضِ کوثر

حشرات الارض کا خطرناک جانور

سید عارب سرفراز

بچھو کے سر، سینے اور پیٹ کے بعد اس کی دُم ہوتی ہے جس کے آخر میں زہر کی تھیلی ہوتی ہے۔ اس تھیلی کے منھ پر ایک سخت، نوکیلا کانٹا ہوتا ہے جسے "ڈنک" کہتے ہیں۔ اس ڈنک میں ایک سوراخ ہوتا ہے جس سے وہ اپنے شکار کے جسم میں زہر داخل کرتا ہے۔ عام بچھوؤں کی پانچ آنکھیں جبکہ کچھ بچھوؤں کی آٹھ آنکھیں ہوتی ہیں۔

زہر جو بچھو جتنا بڑا ہوتا ہے اس میں اتنا ہی زیادہ زہر ہوتا ہے۔ بعض بچھوؤں، مثلاً "کالے بچھو" کے کاٹنے سے انسان کی موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔

غذا چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑے بچھو کی مرغوب غذا ہیں۔ یہ چیونٹیاں اور گھاس کے ننھے منے کیڑے مکوڑے بھی شوق سے کھاتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق بچھو ایک سال سے زائد عرصے تک بغیر خوراک کے زندہ رہ سکتا ہے۔ جو بچھو نم علاقوں میں رہتے ہیں انھیں پانی کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے جبکہ جو بچھو جنگلوں میں رہتے ہیں وہ پانی پیے بغیر کئی ماہ تک زندہ رہ سکتے ہیں۔

اقسام بچھوؤں کی مختلف اقسام ہوتی ہیں جن میں سب سے زیادہ خطرناک، موذی اور زہریلا بچھو "کالا بچھو" ہوتا ہے۔ ایک اور قسم ہے جسے 'عام بچھو' کہتے ہیں یہ مٹیالے رنگ کا ہوتا ہے۔

کالا بچھو ــــ سب سے زہریلا بچھو کالا بچھو سب سے زیادہ خطرناک، موذی اور زہریلا ہوتا ہے۔ اس کی لمبائی چھ سے دس انچ تک ہوتی ہے۔ اس کا رنگ بہت زیادہ سیاہ ہوتا ہے۔ کالا بچھو اگر انسان کو ڈس لے تو انسان کے اعضا ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ سانس لینے میں مشکل پیش آتی ہے اور بعض دفعہ تو موت واقع ہو جاتی ہے۔

بچھو کے دشمن

جی ہاں بچو! آپ کو یہ جان کر ضرور حیرت ہوئی ہوگی کہ بچھو کے بھی دشمن ہوتے ہیں۔ میکسیکو کے گرم جنگلات اور وسطی امریکا میں لشکری چیونٹیوں کی فوج ان پر پل پڑتی ہے اور آن کی آن میں بچھو تتر بتر ہو جاتے ہیں۔ افریقہ کے بندر ان کی دم علیحدہ کر کے بقیہ جسم کھا لیتے ہیں۔ سیاہ چیونٹیاں ان کی سب سے بڑی دشمن ہیں۔ اگرچہ یہ ان کے ہاتھ تو نہیں لگتے لیکن اگر کسی طرح یہ چیونٹیاں ان کو پکڑ لیں تو ان کو بہت مزے لے لے کر کھاتی ہیں۔

انڈے اور بچے

ایک مادہ بچھو ایک وقت میں تیس سے چالیس انڈے دیتی ہے۔ پیدائش کے وقت یہ بچے بہت نازک اور بے بس ہوتے ہیں۔ ان کی ماں انھیں اپنی کمر پر موجود تھیلی میں لے کر تقریباً ایک ہفتہ تک پھرتی ہے۔ ایک ہفتہ بعد یہ اپنی ماں کی کمر سے اترتے ہیں اور خوراک کی تلاش شروع کرتے ہیں۔

گرمی اور بچھو

بچھو کو گرمی سخت ناپسند ہے۔ جب موسم گرما آتا ہے تو بچھو زمین میں ایک سوراخ بنا کر اس میں رہنے لگتا ہے اور اس بل سے باہر بہت کم نظر آتا ہے۔ موسم برسات کے آتے ہی یہ سوراخ سے نکل جاتا ہے اور پتھروں کے پیچھے شکار کی گھات میں بیٹھ جاتا ہے۔ بچھو دھوپ اور گرمی سے بہت زیادہ گھبراتے ہیں۔ اس کا اندازہ آپ اس طرح کر سکتے ہیں کہ اگر انھیں کسی ایسے ڈبے میں بند کر دیا جائے جس میں بہت زیادہ گرمی ہو تو یہ مر جاتے ہیں۔ چلچلاتی دھوپ میں ان کو رکھنے سے چند منٹ میں ان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ جب کسی بچھو کو دھوپ میں رکھا جاتا ہے تو یہ اِدھر اُدھر سایے کی تلاش میں بھاگتا ہے۔ مگر جب اس کو کوئی سایہ نہیں ملتا تو یہ اپنے آپ کو ڈنک مار کر ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتا ہے۔

کاغذ سے بنایا گیا بچھو

راز کی بات

جاوید بسام

ایک عام سے واقعے میں ایک گہری راز کی بات چھپی ہوئی تھی

ماموں جان ہمیشہ مصروف رہتے، کبھی سفر سے تھکے ہوئے واپس آرہے ہیں تو کبھی جانے کی تیاری ہو رہی ہے۔ ہم بچوں کے لیے ان کی شخصیت بڑی پرکشش تھی۔ اعلیٰ تعلیم اور نگر نگر کی سیاحت کرنے کی وجہ سے ان کے پاس قصے کہانیوں اور دلچسپ معلومات کا بیش بہا خزانہ موجود ہوتا اور پھر طرزِ بیان اتنا دلچسپ کہ سننے والوں پر سحر طاری ہو جاتا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ بہت کم ہاتھ آتے تھے لیکن ہم بھی موقع کی تلاش میں رہتے۔ جونہی موقع ملتا ہم انھیں گھیر لیتے۔

اُس دن بھی ہم نانی جان کے گھر جمع تھے۔ شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے اور باہر خاصی سردی تھی۔

ہم مونگ پھلیاں چھیل کر کھا رہے تھے۔

ہمیں اپنے گرد جمع ہوتا دیکھ کر ماموں جان گویا ہوئے:

”بھئی تم لوگ یقیناً مجھ سے کوئی کہانی سننا چاہتے ہو

لیکن ان دنوں میں کام میں اتنا اُلجھا ہوا ہوں کہ کچھ بھی یاد نہیں آ رہا۔"

وہ کچھ دیر سوچتے رہے پھر بولے:"چلو آج میں تمھیں ایک ایسا آنکھوں دیکھا واقعہ سناتا ہوں جو دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی، تم لوگ اپنا دماغ حاضر رکھنا اور بیچ میں ٹوکنا نہیں۔"

ہم سب ماموں جان کے گرد سنبھل کر بیٹھ گئے۔

وہ بولے:"ہم راہ میں گزرتے ہوئے ان گنت لوگوں کو دیکھتے ہیں۔ کسی پر سرسری سی نظر ڈال کر آگے بڑھ جاتے ہیں اور کوئی ہماری توجہ اپنی طرف کھینچ لیتا ہے دنیا ایک عجائب خانہ ہے ہر روز نت نئے چہرے اور واقعات نظروں کے سامنے چلے آتے ہیں۔ غالباً ہفتے کا دن تھا۔ میں لاہور سے بذریعہ ٹرین کراچی آ رہا تھا۔ تم لوگ جانتے ہو گے کہ ٹرین اکثر اسٹیشن کے علاوہ بھی کسی جگہ پر کچھ دیر کے لیے رک جاتی ہے ایسا تب ہوتا ہے جب آگے پٹڑی پر کچھ کام ہو رہا ہو یا کسی دوسری گاڑی نے گزرنا ہو۔ بہر حال اس دن بھی ایسا ہی ہوا گاڑی اسٹیشن سے دور ایک جگہ رک گئی۔

وہ کوئی چھوٹا سا گاؤں تھا۔ ساتھ ہی لہلہاتے کھیت نظر آ رہے تھے۔ شام کی نارنجی کرنوں سے ہر چیز چمک رہی تھی۔ ٹرین کے مسافر حسب عادت کھڑکیوں سے باہر جھانک رہے تھے۔ گاؤں کے لوگ بھی ٹرین کی طرف متوجہ تھے، بچے مسافروں کو دیکھ کر ہاتھ ہلاتے ہوئے مسکرا رہے تھے۔ میں بھی اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ اچانک میری نظر ایک نو دس سال کی بچی پر پڑی۔ وہ پٹڑی سے کچھ دور اپنے کام میں اس طرح مصروف تھی کہ اس کی پیٹھ ٹرین کی طرف تھی۔ لگتا تھا اسے مسافروں اور گاڑی سے کوئی غرض نہیں۔ میں غور سے اسے دیکھتا رہا، دیکھتے ہی دیکھتے اس نے دو اینٹیں رکھ کر چولھا سا بنایا، چند لکڑیاں جمع کر کے آگ جلائی اور اس پر ایک کڑاہی نما برتن رکھ کر کچھ بھوننے لگی۔ کچھ دیر بعد فضا میں سوندھی سوندھی خوشبو پھیل گئی۔ وہ مکئی (پاپ کارن) بھون رہی تھی۔ اس کی چابک دستی سے لگتا تھا کہ یہ اس کا روزمرہ کا کام ہے۔ اس کی تندہی حیرت انگیز تھی، قریب ہی غالباً اس کی عمر رسیدہ دادی زمین پر بیٹھی اسے کام کرتا دیکھ رہی تھی۔

کچھ دیر بعد مکئی تیار ہو گئی، اس نے انھیں کاغذی تھیلیوں میں بھرا اور ٹرین کی طرف آ گئی۔ پھر وہ اپنی باریک سی آواز میں دس روپے دس روپے آوازیں لگانے لگی۔ مسافروں نے جو ریل کے باسی سموسوں اور غیر معیاری مشروبات سے بے زار تھے، مکئی ہاتھوں ہاتھ لی اور چند لمحوں میں نہ صرف اس کی ساری تھیلیاں بک گئیں، بلکہ مزید لوگوں نے طلب ظاہر کی۔ لڑکی تیزی سے واپس لوٹ گئی اور پھر تھوڑی دیر بعد خوشبودار مکئی لیے آ موجود ہوئی۔ ایک تھیلی میں نے بھی خریدی۔ مکئی کے ذائقے میں مجھے بچی کی محنت گھلی ہوئی محسوس

ہوئی۔غرض کوئی آدھے گھنٹے میں اس معصوم بچی نے پچیس تیس تھیلیاں بیچ ڈالیں۔آخر گاڑی نے وسل بجائی اور آہستہ آہستہ رینگنے لگی۔اب بچی بھی دوسروں کی طرح گاڑی کی طرف رخ کیے ہاتھ ہلا رہی تھی اس کی آنکھوں میں تشکر تھا۔" یہاں پہنچ کر ماموں جان خاموش ہوگئے۔

ہم حیران تھے کہ پھر کیا ہوا؟ ہمارے چہروں پر لکھا سوال ماموں جان نے پڑھ لیا وہ بولے:" بھئی اس واقعے کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ جب بچی اپنی اس سرگرمی میں مصروف تھی، ایک ہٹی کٹی فقیرنی ہر کھڑکی کے آگے ہاتھ پھیلائے بھیک مانگ رہی تھی۔شاید چند ہی لوگوں نے اس کی طرف کچھ سکے اُچھالے ہوں گے ورنہ زیادہ تر لوگوں نے اسے مایوس ہی لوٹا دیا تھا آخر وہ منہ بنائے خاموشی سے ایک طرف جا بیٹھی تھی۔"

یہ سن کر ہم سے بیشتر بچے بات کی تہہ تک پہنچ کر سر ہلانے لگے۔ہم پر محنت کی عظمت کا راز کھل گیا تھا۔

☆......☆

فیصلہ کن معرکہ

کشمیر کی جنگ میں مجاہدین یہ بات ثابت کر چکے ہیں کہ مسلمان کا لوہا آج بھی ہر لوہے کو کاٹ سکتا ہے۔محمد بن قاسم، محمود غزنوی اور احمد شاہ ابدالی کے جانشینوں کا خون ابھی تک سرخ ہے لیکن وہ بڑی جنگ جس کی یہ ایک تمہید ہوسکتی ہے ایک گروہ ایک فوج اور ایک حکومت کا دوسری فوج یا حکومت کے ساتھ تصادم نہیں ہوگا بلکہ یہ دو قوموں، دو تہذیبوں اور دو تہذیبوں اور دو نظریوں کا ایک فیصلہ کن معرکہ ہوگا یہ وہ جنگ ہوگی جس میں کفر برعظیم سے اسلام کا نام مٹانے کے لیے اپنی پوری قوت کے ساتھ میدان میں آئے گا اور پاکستان کے مسلمان اگر زندہ رہنا چاہتے ہیں تو انھیں اپنے بلند عزائم کا ثبوت دینا ہوگا۔

(نسیم حجازی کے ناول "شاہین" سے انتخاب)

اس تصویر میں دس فرق تلاش کریں
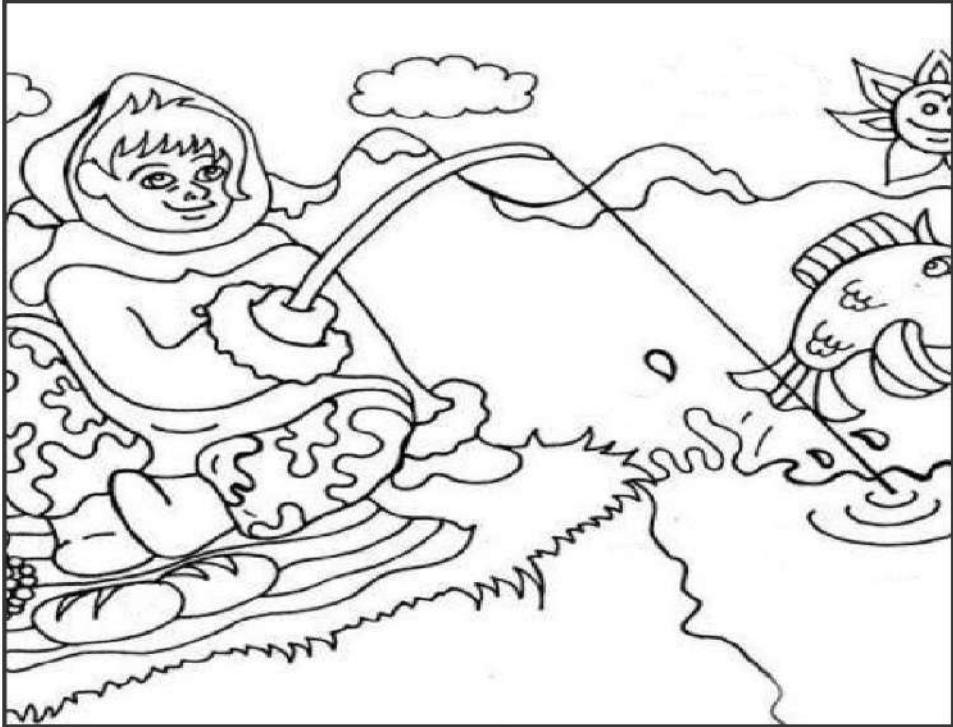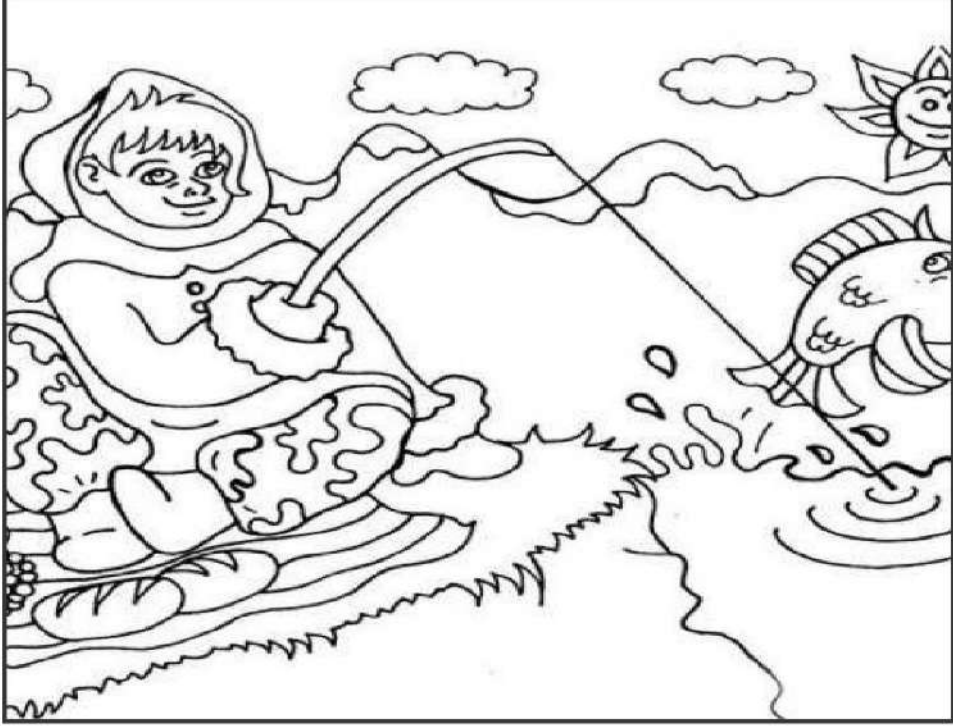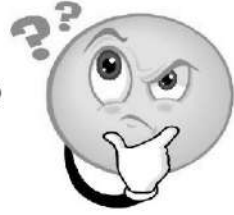
ساتھیو! ہوجائیں تیار...... کیوں کہ ساتھی ایک بار پھر لایا...... ایک نیا اور انوکھا انعامی سلسلہ...... تاریخ کی سیر کیجیے...... مسلم حکمرانوں، سیاست دانوں، سائنس دانوں اور ان شخصیات سے ملیے جنھوں نے تاریخ کا دھارا بدل کر رکھ دیا...... بذریعہ قرعہ اندازی جیتنے والے ساتھیوں کو **اکیڈمی بک سینٹر** کی جانب سے دی جائیں گی ڈھیر ساری کتابیں اور تاریخی سی ڈیز...... تو پھر تیار ہیں ناں آپ...... تاریخ کی کھوج کے لیے......!!

زمانہ قدیم سے ہی مختلف تہذیبوں اور قوموں کا سنگم سرزمین۔ بحیرہ عرب اور بحیرہ اسپین کے درمیان ساری تجارت اسی سرزمین کے ذریعے ہوئی۔ ۱۲۹۲ء میں سب سے پہلے یورپی سیاح مارکو پولو کی کشتی یہاں سے گزری۔ اسی جگہ ۱۵۱۱ء میں پرتگالی فتنہ باز البوقرق ایک ہاتھ میں تلوار اور ایک ہاتھ میں بائبل لے کر اترا۔ ۱۶۱۴ء میں ولندیزیوں نے یہاں سے پرتگالیوں کو ہٹا کر اپنا تسلط قائم کیا۔ بعد میں انگریزوں نے اسی سرزمین کو اپنی جاگیر بنالیا۔ انگریزوں کا یہاں تقریباً ۱۰۰ سال قبضہ رہا۔ ملک کے شمالی حصے میں اونچے پہاڑی سلسلے ہیں جن کی بلندی شمال سے جنوب کی طرف بتدریج کم ہوتی جاتی ہے۔ پچاس کی دہائی میں اس ملک کو انگریزوں کے تسلط سے آزادی ملی۔ اس کا دارالحکومت ۱۸۷۴ء تک ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اب دنیا کے جدید اور عظیم شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ اس ملک کے دو حصے ہیں جن کے بیچ میں سمندر حائل ہے۔ رقبے کے لحاظ سے دنیا کا ۶۷ واں بڑا ملک ہے۔ یہاں کی ثقافت میں بھارتی اور چینی ثقافت کی جھلک نمایاں ہے۔ اس کی ایک وجہ یوں بیان کی جاتی ہے کہ آزادی کے بعد اپنے ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے یہاں کی حکومت نے پاکستانی صدر کو اپنے ہاں دعوت دی۔ پاکستانی فوجی صدر وہاں پہنچے تو اُن کے سامنے پاکستانی کاریگروں اور مزدوروں کی قیمتیں (مزدوری کے ریٹ) پیش کی گئیں۔ صدرِ پاکستان نے یہ کہہ کر مطالبہ مسترد کر دیا: ''کیا اس جنگل میں مَیں نے اپنے لوگ مروانے ہیں؟'' پھر اس حکومت نے انھی قیمتوں پر بھارتی اور چینی کاریگروں اور مزدوروں کو اپنے ہاں بلوایا۔ اس ملک کے ایک سابق وزیرِ اعظم جنھیں جدید ملک کا بانی کہا جاتا ہے۔ پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر ہیں۔ اُن کے دادا کا تعلق پاکستانی علاقے کوہاٹ سے بتایا جاتا ہے۔ وہ ۲۲ سال ملک کے وزیرِ اعظم رہے۔ اُنھوں نے ہی پہلی اسلامی یونیورسٹی کی بنیاد رکھی اور ۱۹۸۳ء میں بلاسود بینکاری کا

آغاز کیا۔ان کی معاشی پالیسیاں ترقی پذیر ممالک کے لیے ایک روشن مثال ہیں۔اپنے ملک کی ڈوبتی معیشت کو صرف دس سال میں ترقی یافتہ ممالک کی صف میں لا کھڑا کیا۔حتیٰ کہ ۲۰۰۸ء کے عالمی معاشی بحران میں بھی اس کو زیادہ نقصان کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔کرنسی کے شدید بحران میں بھی آئی ایم ایف اور عالمی بینک کی پالیسیوں اور قرضوں پر چلنے کے بجائے خود اپنی راہ متعین کی اور اپنے ملک کو بحران سے نکالا۔اسرائیلی اور امریکی مسلم مخالف پالیسیوں کے سخت مخالف رہے اور کھل کر ان کی پالیسیوں کو تنقید کا نشانہ بناتے۔اپنے ملک میں ان ممالک کی مصنوعات کا مکمل اور کامیاب بائیکاٹ کیا۔آج کل ایک ملکی فلم میں کام کے حوالے سے ان کا نام لیا جارہا ہے۔

سوالات: ۱)اس ملک کا مکمل نام کیا ہے؟

۲)تاریخ آزادی کیا ہے؟

۳)مذکورہ پاکستانی صدر کا نام کیا ہے؟

۴)مذکورہ وزیرِ اعظم کا نام کیا ہے؟

۵)اس ملک کے پڑوسی ممالک کون کون سے ہیں؟

کوپن تاریخ کی کھوج (۴)

نام ____________________

کلاس __________ فون __________

پتہ ____________________

____

ای میل ____________________

☆...... پچھلے صفحہ پر دیئے گے کوپن کو احتیاط سے پر کریں۔

☆...... نیچے دیئے گے کوپن میں جوابات درست نمبر کے ساتھ لکھیں۔

☆...... کوپن کو ہر ماہ کی 30 تاریخ تک ساتھی کے مندرجہ ذیل پتے پر روانہ کریں۔

☆...... کوپن میں اپنا فون نمبر لازمی درج کریں۔

☆...... جو قارئین انعامی سلسلہ میں بذریعہ ای میل شریک ہونا چاہتے ہیں وہ کوپن کو اسکین کر کے ہمیں روانہ کر سکتے ہیں

پتا: F-206 سلیم ایونیو، بلاک 13-B گلشن اقبال، کراچی۔فون:021-4976468

ای میل:monthlysathee@hotmail.com

جوابات

۱ ________________

۲ ________________

۳ ________________

۴ ________________

۵ ________________

تاریخ کی کھوج (۲)

درست جوابات:

☆......حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ

☆......حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ (والد)، اُمّ المومنین حضرت اُمِ حبیبہ رضی اللہ عنہا (ہمشیرہ)

☆......قبرص کے مقام پر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں لڑی گئی۔

☆......میری امت کا پہلا لشکر جو قیصر کے شہر پر حملہ کرے گا بخشا بخشایا ہے۔(بخاری)

بذریعہ قرعہ اندازی پانچ درست جوابات دینے والے انعام یافتگان

ماریہ سلیم محمود (لانڈھی)

بشریٰ نور وفائی (کراچی)

احمد عمار خان (لانڈھی)

اویس وجاہت اللہ (نارتھ کراچی)

بشریٰ محمد (کراچی)

ان ساتھیوں نے بھی اچھی کوشش کی:

محمد حنظلہ بن مختار (نارتھ ناظم آباد)، مطیب مختار (کراچی)، کومل فاطمہ اللہ بخش (لیاری)، وانیہ شیخ (حیدر آباد)، آمنہ شفیق (نارتھ ناظم آباد)، مرزا ہادی بیگ (حیدر آباد)، سامہ طٰہٰ (لاہور)، شرجیل عباسی (جھنگ)، عبدالصمد (گجرات)، حق داد حمزہ زئی (لورالائی)، عمار جاوید (کراچی)، عدنان اقبال (راولپنڈی)، محمد عارف (لورالائی)، وکیل الرحمٰن (لورالائی)، عمیر خان (کراچی)، اسامہ سعید (کراچی)، اشرف خان (پشاور)، حیدر علی شاہ (ٹنڈو جام)، عروبہ رضوی (کراچی)، محمد ابراہیم (سکھر)، محمد علی (سکھر)، انس جاوید (کراچی)، ماہ نور خان (کراچی)، افشاں محمود (کراچی)، منیبہ اکمل (کراچی)، انس حسین (کراچی)، یمنہ عابد (کراچی)، رقیہ ابراہیم (کراچی)، وارث شاہ (جھنگ)، عبدالصمد خان (لاہور)، فیصل عابد (راولپنڈی)، شیخ یونس (گجرات)، سمیع اللہ (پشاور)، امام علی (اسلام آباد)، فیضان قیوم (ملتان)، ثمینہ احمد (بہاولپور)،

واحد بلوچ (کراچی)، عمار احمد (سکھر)، فائزہ شیخ (کراچی)، عارف اللہ (کراچی)، مجتبیٰ احمد (سکھر)، بتول فاطمہ (شیخوپورہ)، عزیز اللہ (پشاور)، معاذ احمد (کراچی)، طفیل محمد (راولپنڈی)، عاصم ممتاز (کراچی)، راشد علی (اسلام آباد)، وقار عزیز (لاہور)، شمس الحق (راولپنڈی)، افشاں نوید (سکھر)، سلطانہ خان (اٹک)، باقر رضا (جھنگ)، حیدر مصطفیٰ (فیصل آباد)، امجد بھٹی (لاہور)، صائمہ فاروق (سیالکوٹ)، حسنین شاہ (کوئٹہ)، عاطف حماد (کراچی)، اسد اللہ (سیالکوٹ)، سعد حسن (لاہور)، سعد ارشاد (حیدر آباد)، عزیر فاروق (کراچی)، حرا سمیع (لاہور)، حنا فیض (لاہور)، رابعہ وسیم (حیدر آباد)، رمیل حسن (کراچی)، شمائلہ حسین (کوٹری)، ریحان صابر (کراچی)، احسن عاصم (کراچی)، عظمیٰ آفریدی (کراچی)، دانش ذوالفقار (کراچی)، عالیہ اکبر (سکھر)، سمیعہ پرویز (کراچی)، شہروز خان (نصیر آباد)، باقر حسین (بلوچستان)، اقراء شکیل (کراچی)، فرخ احمد (کراچی)، عبدالرافع فاروقی (کراچی)، مریم عباسی (کراچی)، مظہر علی (بلوچستان)، حافظ عبدالعزیز (کراچی)، محمد عبدالعزیز (کراچی)، منیف انور (پشاور)، حسن عابد (کراچی)، راشد ملک (کراچی)، صہیب رشید (گوجرانوالہ)، عریش الدین (کراچی)، علی انوار (کراچی)، کومل خالد (کراچی)، ام حبیبہ (کراچی)، عماد عزیز (کراچی)، کامل زبیر (روہڑی)، زوہیب اشفاق (کراچی)، یسریٰ جاوید (کراچی)، کامران حسن (نصیر آباد)، شماس انصاری (کراچی)، بلال نسیم (کراچی)، مریم رفیع (کراچی)، روہیل ابڑو (خیر پور)، نبیل امتیاز (کراچی)، جویریہ سعید (سکھر)، عبدالرشید مینگل (بلوچستان)، اورنگ زیب مینگل (بلوچستان)، حمزہ تحسین (کراچی)، عبدالباسط زہری (نصیر آباد)، محمد ابراہیم (ڈیرہ مراد جمالی) تنزیل الرحمٰن (کراچی)، حذیفہ رضوان اللہ (کراچی)، عبدالجبار (بلوچستان)، محمد عیان (کراچی)، ناصرہ اکرام (کراچی)، رامین طیبہ (کراچی)، ثناء اللہ میرالی (نصیر آباد)، گل حسن (نصیر آباد)، زیب علی (کراچی)، حمدیٰ سعیب (کراچی)، عثمان سعید (کراچی)، حشمت علی (بلوچستان)، شرجیل مشتاق (کراچی)، چاکر خان (کراچی)، بلال لطیف (کراچی)، نور العلمہ (کراچی)۔

ہم اور ویگن

فردوس عالم

ہمارے ایک دوست کو عجیب سا شوق ہو چلا ہے۔ جب بھی فارغ وقت ملے، مسلسل گردن جھکائے کھڑے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی بہت دیر تک کسی درخت کی ٹہنی پکڑے رہتے۔ اکثر و بیشتر بغیر کسی مقصد کے بازار میں کسی مجمع میں شامل ہو کر سانس روکنے کی مشق کرتے ہیں۔

آخر جب ہماری حیرت حد سے زیادہ ہوگئی، تو اُن سے پوچھ ہی لیا کہ یہ اتنی سخت سخت مشقیں کیوں کر رہے ہو؟ کہنے لگے: ''یہ تو میں مستقل کرتا ہوں کیونکہ مجھے روزانہ ویگن میں سفر کرنا ہوتا ہے۔ ویگن میں صرف وہی شخص سفر کر سکتا ہے جو ہر طرح ''پروف'' ہو... یعنی واٹر پروف، شاک پروف، ہوا پروف، لائٹ پروف اور پروف ہی پروف۔ اگر ویگن میں سفر کرنا ہو، تو گردن کا ایکسل اتنا مضبوط ہونا چاہیے کہ اس کو خواہ کتنا ہی جھکایا جائے، ٹوٹ نہ پائے۔ گردن ہو تو ایسی کہ اگر اس کے اوپر کچھ گردنیں مع سر کے لاد دی جائیں، تو بچاری اُف نہ کرے... اور... ہاں بازو ہوں، تو ایسے جو ایک جگہ سے دوسری جگہ ہلنے جلنے پر ضد نہ کریں۔''

یقیناً ہمارے دوست کا بیان بالکل صحیح تھا۔ کیونکہ ایک دفعہ ہم نے بھی تجربہ کیا۔ ہم سواری کے انتظار میں کھڑے تھے۔ اچانک ایک ویگن ہمارے سامنے رکی۔ دروازہ کھلا، دیکھا کچھ لوگ اندر حالت رکوع میں ہیں... کچھ ایسے بیٹھے تھے جیسے ابھی اُترنے والے ہوں۔ کچھ چہرے کی شکنیں بار بار سیدھا کرنے کی کوشش کر رہے تھے تا کہ کسی طور سفر سے لطف اندوز ہو سکیں۔ ہم نے

اسٹاپ پر کھڑے ہی کھڑے یہ منظر دیکھا۔ ہمارے قدم پیچھے ہٹ گئے۔

ڈرائیور نے کنڈکٹر سے کہا: ''سواری باہر کھڑی ہے، اس کو بھی اندر لے آؤ۔'' کنڈکٹر بولا ''جگہ نہیں ہے۔'' ڈرائیور بولا ''اُڑا لے، سنگل پسلی ہے۔ اُڑا لے، سوا لاکھ جگہ ہے۔'' یہ ہدایت پا کر کنڈکٹر نے ایک ہاتھ سے ویگن کا دروازہ پکڑا اور دوسرا ہاتھ کمر میں ڈال کر ہمیں اس طرح اٹھایا جیسے ریکٹ سے شٹل کاک اٹھا رہا ہو۔ یوں ہم بھی ان لوگوں کی صف میں شامل ہو گئے جنھیں ویگن میں سفر کرنے پر فخر تھا۔ کہنے کو تو ہم ویگن پر سوار تھے لیکن سچ پوچھیے، تو وہ ہم پر سوار تھی... بہر حال خوش تھے کہ ہمارا شمار بھی ویگن کی سواریوں میں ہونے لگا۔ ہم نے اپنا ہاتھ نشست کے تکیے پر رکھنا چاہا، تو آواز آئی ''ہائے... ہائے...''

ہم حیران کہ یہ کیسی نشست ہے جس میں سے انسانی آواز آ رہی ہے... لیکن وہ نشست نہیں بلکہ ایک مسافر کا کندھا تھا... بہر حال ہاتھ تو کہیں نہ کہیں رکھنا ہی تھا، اس لیے اٹھا کر دوسرے مسافر کے کندھے پر رکھ دیا۔ کبھی کبھی ہاتھ اٹھا کر اپنی گردن پر بھی رکھ لیتے، صرف یہ تصدیق کرنے کے لیے کہ وہ واقعی سر سے جڑی ہوئی ہے یا نیچے گر گئی... نیچے جھک کر بھی دیکھ سکتے تھے، لیکن اگر ایسا کرتے، تو کئی دوسرے مسافر بھی ہمارے ساتھ اڑ... اڑ... ر... دھم کر کے نیچے گر جاتے... اس لیے جذبہ خدمتِ خلق کے تحت ہم نے ایسا کرنا مناسب نہ سمجھا۔

ابھی کچھ دور ہی بڑھی تھی کہ کنڈکٹر نے بڑی شد و مد سے کرائے کا مطالبہ کر دیا۔ ہم ایسی حالت میں نہیں تھے کہ اپنی جیب میں ہاتھ ڈال سکتے کیونکہ بالکل مجسمہ بنے ہوئے تھے۔ یہ بہر حال ممکن بلکہ بہت صحیح اندیشہ تھا کہ ہم جیب میں پیسے نکالنے کے لیے ہاتھ ڈالیں، تو ہاتھ کسی دوسرے مسافر کی جیب میں پہنچ جائے... اس اندیشے کی وجہ سے ہم نے کنڈکٹر سے مہلت چاہی کہ جب ہم اتریں گے، تو کرایہ دے دیں گے۔ کنڈکٹر نے ہماری درخواست قبول کر لی۔ صرف یہی نہیں بلکہ ایک لمبی نشست پر بیٹھے کچھ لوگوں سے کہا: ''ساتھ ساتھ ہو جاؤ... ساتھ ساتھ ہو جاؤ۔''

جب وہ مسافر اپنی جگہ سے نہ کھسکنے کے برابر کھسک گئے، تو کنڈکٹر نے ہماری طرف ہمدردی کی نگاہ سے دیکھا اور کہا: ''بابو جی! آپ یہاں بیٹھ جایئے۔'' ہم نے پوچھا ''کہاں بیٹھ جائیں؟'' کہنے لگے ''یہاں ہی... یہ ''سیٹ'' ہے۔'' ہماری آنکھیں کوئی نشست تلاش نہ کر سکیں۔ کنڈکٹر نے بہر طور ہمیں بہ نفس نفیس اس جگہ بٹھایا جس کو وہ ''نشست'' کہنے پر مصر تھے... ابھی کچھ ہی دیر اس نام نہاد ''سیٹ'' پر بیٹھے تھے کہ کنڈکٹر نے ہم سے کہا ''بابو جی! آپ پچھلی سیٹ پر آ جایئے۔''

ہم کئی مسافروں کو پھلانگتے اور رگیدتے ہوئے پچھلی ''سیٹ'' پر پہنچ بیٹھ بلکہ اڑ گئے... خوش تھے کہ چلو بیٹھنا تو نصیب ہوا۔ ابھی صحیح طرح بیٹھ بھی نہ پائے تھے کہ کنڈکٹر نے کہا ''بابو جی... یہ کچھ نئی سواریاں ہیں... آپ ایسا کریں کہ اگلی ''سیٹ'' پر آ جائیں۔'' ہم بغیر چوں و چرا کیے اگلی نشست پر آئے اور تقریباً بیٹھ گئے... غرض ایک نشست سے دوسری پر دوسری سے تیسری، تیسری سے چوتھی پر ہم مسلسل نشستیں بدلتے رہے۔ اس کام کے لیے ہمیں ویگن کے اندر اتنا چلنا پڑا کہ یقین جانیے... اگر اتنا پیدل چلتے تو نہ معلوم کب کے منزل مقصود تک پہنچ جاتے۔

آرٹسٹ

حماد ظہیر

کاشف کبھی پہاڑ کی چوٹی کے اوپر کبھی دریا میں کشتی رانی تو کبھی رولر اسکیٹنگ اور مچھلیاں پکڑتا رہا تھا

کاشف کے کئی کمالات تو مجھے وقتاً فوقتاً پتا چلتے ہی رہے تھے لیکن اس کا ایک کمال مجھے اس کے گھر جا کر ہی معلوم ہوا۔

کاشف واقعی باکمال تھا۔ ہم سارے دوست حیران ہوتے کہ اس نے ذرا سی عمر میں کیا کیا کچھ نہ کرلیا تھا گوکہ وہ انتہائی خاکسار تھا اور کبھی جتانے کے لیے اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ نہ کرتا، لیکن ہم سب جانتے تھے کہ وہ ہرفن مولا ہے۔ ہم میں سے اکثر لڑکے یہ حسرت کرتے کہ کاش انہیں کاشف جیسی صلاحیتوں اور اس کے جیسے تجربات کا دسواں حصہ ہی مل گیا ہوتا۔

تیس مار خان بننے کا شوق تو ہر کسی کو ہوتا ہے، اکثر لوگ گھڑے گھڑائے واقعات بھی سنانے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن ان پر کوئی یقین نہیں کرتا کیونکہ ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہوتا۔ کاشف تو پہلے ثبوت پیش کرتا،

پھر بڑے انکسار و انکساری سے واقعہ بیان کرتا۔
دراصل اس کے ابو کو فوٹو گرافی کا بے حد شوق تھا لہٰذا ہر خاص موقع کی کاشف کے پاس تصویر ہوتی۔
بقول کاشف کے، اس کے پاس گھر پر ایک البم صرف اسی کی تصاویر سے بھرا پڑا ہے، جو کہ عام خاندانی قسم کی نہ تھیں بلکہ سب ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ وہ اکثر ان میں سے کوئی نہ کوئی تصویر نکال کر لے آتا اور بڑی خاکساری سے اسے دکھاتا پھرتا۔
''یہ تو ہم مری گئے تھے گھومنے، چاچو کو شکار کا بہت شوق تھا، بندوق لیے کھائیوں میں اُتر جاتے، ایک مرتبہ اتفاقاً یہ چیتا نظر آ گیا، اور انھوں نے شکار کر ڈالا، میں نے بھی بندوق ہاتھ میں لے کر ساتھ کھڑے ہو کر تصویر کھنچوالی۔'' ہم لوگوں نے دیکھا ایک شکار کیے ہوئے چیتے کے پاس کاشف بڑی سی بندوق تھامے کھڑا ہے۔
''یہ دیکھو، ہم میچ دیکھنے گئے تھے، میں چھوٹا تھا اس لیے مجھے سیکورٹی والوں نے نہیں روکا۔'' وہ کہتا۔
اور ہم دیکھتے کہ کاشف مشہور ترین کھلاڑیوں کے درمیان کھڑا ہے یہ تو شاید ایک عام بات ہوتی، لیکن ٹیم کے کپتان نے اسے گود میں بھی اٹھایا ہوا تھا۔
''یہ فلاں فلائنگ کلب کی تصویر ہے۔ میں پائلٹ کی سیٹ پر بیٹھا تو ایسا لگ رہا ہوں جیسے ساری عمر جہاز ہی اُڑاتے گزری ہو، لیکن میں صرف تصویر کھنچوانے کے لیے بیٹھا تھا۔'' ہم دیکھتے کہ وہ ہیلمٹ وغیرہ پہنے جہاز میں بیٹھا ہے۔
''یہ میری ڈرائنگ کے مقابلے کی تصاویر ہیں۔ ہمیں پتا تھا کہ کاشف کی ڈرائنگ بہت اچھی ہے، چاہے ہاتھ سے ہو چاہے کمپیوٹر سے اور اس پر وہ ہمارے سامنے کئی انعامات جیت چکا تھا۔ ہماری کلاس کی دیواروں پر اکثر پوسٹر اُسی کے بنائے ہوئے تھے۔
''ایک زمانے میں مجھے گھڑسواری کا بہت جنون ہوا۔ گو کہ میری عمر نہیں تھی پھر بھی دیکھو!'' وہ خود ہی کہتا اور ہم اسے ننھی سی عمر میں ایک ماہر گھڑسوار کی طرح عربی نسل کے گھوڑے پر بیٹھا دیکھ کر اَش اَش کر اُٹھتے۔ ساتھ ہی ہم لوگوں کے دل میں بھی اس جیسے تجربات کی خواہشیں انگڑائیاں لینے لگتیں، مگر ہم کر ہی کیا سکتے تھے۔
''یار تم کسی دن اپنا پورا البم کیوں نہیں لے آتے؟'' میں نے ایک دن اس سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔
''یار اول تو وہ لمبا چوڑا اور موٹا بہت ہے، لانا دشوار ہے، دوم امی بھی منع کرتی ہیں کہ قیمتی چیز کو یوں گھر سے باہر لے کر نہیں جانا چاہیے۔''
''ارے تم نے یہ دیکھا۔ میں ایک مرتبہ ایئربیس گیا تھا، پاکستان ایئرفورس کے، میرے ماموں ہیں نا وہاں!'' اس نے بستے سے ایک تصویر نکال کر دکھائی۔ شاید یہ تصویر اس کے بستے میں رکھی رہ جاتی لیکن

میرے تصویری البم کے ذکر پر اسے یاد آ گئی۔
میں نے دیکھا کاشف شاندار قسم کے جنگی جہازوں کے بیچ کھڑا ہے۔ مجھے جہازوں سے اتنا لگاؤ ہے کہ میں تو اس تصویر میں کھو ہی گیا۔ میری دلچسپی دیکھ کر اس نے چند ایک اور تصاویر نکالیں۔ اب کہیں کاشف معراج طیاروں کے پاس سے گزر رہا ہے تو کہیں طیارے کے نیچے کھڑا ہے۔
''کاش میری ایسی قسمت ہوتی!'' میں نے رشک سے کہا۔
ارے بھائی مسئلہ کیا ہے، PAF کا میوزیم ہے نا تم وہاں جا کر ان طیاروں کو دیکھ سکتے ہو۔'' کاشف بولا۔
میں نے گھر آ کر سوچنا شروع کیا، میرے پاس تو اس قسم کی ایک بھی تصویر نہیں، مجھے ایسا لگا جیسے میری زندگی بے کار گزر رہی ہو، کچھ کیا ہی نہیں میں نے آج تک۔
''امی ہم لوگ گھومتے پھرتے کیوں نہیں؟'' میں نے امی سے پوچھا۔
''ہائیں کیا مطلب۔ ہم لوگ سیر تفریح کرتے تو رہے ہیں۔'' امی حیران ہو کر بولیں۔
''میرا مطلب ہے بڑی قسم کی، یادگار قسم کی۔'' میرے دل کی گہرائیوں سے آواز نکلی۔
''بھئی وہ کیسی ہوتی ہے۔'' امی نے مجھ سے اُگلوانے کی کوشش کی۔
''یہ کہ جیسے کہ...... جیسے...... میرا مطلب ہے جیسی کاشف کرتا ہے۔''
''کیا کرتا ہے کاشف؟'' امی گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولیں۔
''کیا نہیں کرتا کاشف...... کل وہ دکھا رہا تھا کہ اس نے گرمیوں کی چھٹیوں میں کیا کیا۔ وہ پہاڑ کی چوٹی کے اوپر چڑھا ہوا تھا۔ وہ دریا میں کشتی رانی کر رہا تھا، وہ رولر اسکیٹنگ کر رہا تھا۔ وہ تالاب میں بیٹھا مچھلیاں پکڑ رہا تھا۔ وہ گلیشیرز اور برف پر اسکیٹنگ (skating) کر رہا تھا۔ وہ ہر فن مولا ہے امی۔ ہر فن مولا۔'' میری آواز بھرا گئی۔ امی کو بھی اندازہ ہو گیا کہ مسئلہ صرف گھومنے پھرنے کا نہیں ہے بلکہ احساس کمتری کا ہے۔
''دیکھو بیٹا ہر کسی کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ ہر فن مولا بن سکے، لہٰذا تمھیں خدا نے جو صلاحیتیں دی ہیں تمھیں ان کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ آخر کو تم میٹرک کے پوزیشن ہولڈر ہو۔ علم سے بڑھ کر کیا چیز ہو سکتی ہے۔ تمھیں قدر کرنی چاہیے!''
''اوہ...... یعنی میرے پاس کم از کم ایک تصویر تو ہے ہی اسے دکھانے کے لیے۔'' میں نے خوش ہو کر سوچا۔
اگلے ہی دن میں اسے اپنی وہ یادگار تصویر دکھا رہا تھا جس میں مجھے میٹرک میں پوزیشن لینے پر گورنر صاحب سے اعزازی شیلڈ ملی تھی۔

''یار یہ تصویر تم ایک دن کے لیے مجھے دے سکتے ہو؟''
کاشف نے پوچھا۔
''ہاں ہاں کیوں نہیں......لیکن وجہ؟''
''یار میں اپنی امی وغیرہ کو دکھانا چاہتا ہوں!'' اس نے کہا تو میرا بھی دل بڑھا کہ اس نے میرے اس اعزاز کو کسی قابل تو سمجھا اور یہ کہ شاید اس کی زندگی میں صرف یہی واقعہ تھا جو نہ ہوا تھا۔
اگلے روز اس نے مجھے میری تصویر واپس کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی بھی ایک تصویر دکھائی۔ جس میں وہ صدر مملکت سے ہاتھ ملا رہا تھا۔
''ہائیں......ارے اوہ۔'' میں تو یہ دیکھ کر اچھل ہی پڑا۔
''یہ یہ کیا......تم نے کبھی بتایا نہیں؟'' میرا حیرت کے مارے برا حال تھا۔
''بس بھائی کیا کیا بتاؤں۔ تمھاری گورنر کے ساتھ والی تصویر سے یاد آیا۔ لیکن میری یہ تصویر کوئی بڑے اعزاز کی بات نہیں، میری کوئی پوزیشن وغیرہ نہیں آئی تھی۔ بس ایسے ہی جا کر ہاتھ ملا لیا تھا۔''
میں اَش اَش کر اُٹھا۔ یعنی اس نے صدر مملکت سے ہاتھ ملایا اور اسے کوئی بڑی بات نہیں سمجھتا اور مجھے گورنر سے شیلڈ لینے کے لیے میٹرک میں پوزیشن لینی پڑی۔
میں نے کاشف جیسا خوش نصیب ہونا ناممکن خیال کر لیا اور اس کے جیسا بننے کی کوشش ہی ترک کر دی۔
ایک روز مجھے کوئی ایسی ضرورت پڑی کہ مجھے کاشف کے گھر جانا ہی پڑا۔
''یار بڑا اچھا موقع ہے، تم مجھے اپنا البم دے جاؤ تاکہ میں تمھارے ماضی میں اور اپنی خوابوں کی دنیا میں چلا جاؤں۔''
نا جانے کیوں وہ بری طرح ہچکچایا۔ مگر میرے بہت اصرار پر البم تو نہیں البتہ تصویروں کا ایک پلندہ میرے آگے رکھ گیا۔
میں رشک بھرے انداز میں تصویریں دیکھ رہا تھا کہ اچانک میرے آگے ایک جانی پہچانی تصویر اُبھری۔ یہ تصویر میں نے پچاسیوں مرتبہ دیکھی تھی کیونکہ یہ میری میٹرک کی پوزیشن لینے پر گورنر کے ساتھ والی تصویر تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ میری جگہ کاشف سرشاری کے عالم میں کھڑا گورنر صاحب سے شیلڈ وصول کر رہا تھا۔
کاشف واقعی ایک اچھا آرٹسٹ ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین کمپیوٹر ڈیزائنر بھی تھا۔ مجھے اس کی باقی تمام تصاویر کی حقیقت معلوم ہو چکی تھی۔

☆......☆

کیا آپ کو معلوم ہے؟
☆ بھارت وہ ملک ہے جہاں گائے کی آواز کو فاصلے کی اکائی مانا جاتا ہے۔
☆ ترکی کا ایک شہر ہے جس کا نام اردو ہے۔

دلکش پرندہ

شریف شیوہ

آنگن میں آکر، پَر پَھڑ پَھڑا کر
کچھ دیر تڑپا، میں نے جو پرکھا
زخمی تھا سارا
دلکش پرندہ

میں نے اُٹھایا، پانی پلایا
دانہ کھلایا، پنکھا چلایا
اُٹھ بیٹھا پیارا
دلکش پرندہ

پھر وہ پروں کو اپنے پُھلا کر
اُڑنے لگا خود اُونچی فضا پر
لگتا تھا اچھا
دلکش پرندہ

رنگ بھریں

ساتھی مصوّری

☆ مصوری بھیجنے والے ساتھی اپنی ڈرائنگ میں گہرے رنگوں کا استعمال کریں۔ ڈرائنگ شیٹ یا پھر A4 سائز کا سادہ کاغذ استعمال کریں۔ ڈرائنگ کے اوپر اپنا نام ہرگز تحریر نہ کریں بلکہ کاغذ کی پشت پر اپنا نام، فون نمبر، پتا لازماً لکھیں۔ ☆ برقی پتے (ای میل) کے ذریعے ڈرائنگ بھیجنے والے اپنی تصاویر کو اسکین کرکے بھیجیں، موبائل کی تصویر قابلِ قبول نہیں ہوگی۔

رافعہ عثمان

کومل فاطمہ اللہ بخش

علیزہ نذیر

محمد عمر بن عبدالرشید

فائزہ نذیر احمد

بلبلے بنائیں

وہ اشیا جن کی ضرورت پڑے گی

- ☆ ایک باریک تار (wire)
- ☆ گرم پانی
- ☆ سرف (ڈٹرجنٹ پاؤڈر)
- ☆ گرم پانی
- ☆ گلیسرین کے چند قطرے

السلام علیکم دوستو! آپ سب نے بلبلے بنائے ہوں گے یا پھلاتے ہوں گے۔ ہمارا آج کا سبق انہی بلبلوں کے حوالے سے ہے۔ اب آپ کو دکان سے خریدنے کی ضرورت نہیں پڑے گی بلکہ آپ گھر پر بھی بنا سکتے ہیں۔ سب سے پہلے جن اشیا کی ضرورت پڑے گی ان کو اپنے پاس رکھ لیں۔

۱۔ برتن دھونے والا صابن یا سرف، پانی اور گلیسرین کو باہم ملا لیں۔ اس محلول کو چند گھنٹوں کے لیے رکھ دیں (جتنی زیادہ دیر رکھا جائے گا اتنے ہی مضبوط بلبلے بنیں گے) ۲۔ محلول کے اوپر سے صابن کی تمام جھاگ ہٹا لیں۔ اب یہ استعمال کے لیے تیار ہے۔ ۳۔ تار کے ایک حصے کو چھوٹے سوراخ کی صورت میں موڑ لیں۔ اب سرے کو گھمائیں تاکہ ایک عمدہ مضبوط دائرہ ایک لمبے دستے کے ساتھ بن جائے۔

ایسا کیوں ہوا؟ پانی کے اندر ایک ''سطحی تناؤ'' ہوتا ہے جو کہ سطح کے اوپر ایک قسم کی تہ ہوتی ہے۔ یہ تہ بہت مضبوط ہوتی ہے۔ برتن دھونے والا صابن اس تہ میں لچک (کھنچاؤ) پیدا کرتا ہے۔ پانی کے بلبلے اس سطحی تناؤ (تہ) کو تمام سمتوں میں قوت کے ساتھ دھکیلتے ہیں۔ آپ ان بلبلوں سے مزید لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ آپ بھی اپنے کچھ تجربات کرنے کی کوشش کریں۔

۱۔ وقت دیکھیں کہ کتنی دیر آپ کے بلبلے قائم رہتے ہیں۔ ۲۔ دیکھیں کہ آپ ایک بلبلا کتنا بڑا بنا سکتے ہیں۔ ۳۔ دیکھیں کہ کیا آپ مختلف شکلوں کے بلبلے اڑا سکتے ہیں۔ ۴۔ دیکھیں کہ آپ ایک بلبلے کے اندر دوسرا بلبلا بنا سکتے ہیں۔ ۵۔ کھانے میں استعمال ہونے والے رنگ کے کچھ قطرے بلبلوں والے محلول میں ملا کر دیکھیں۔ ۶۔ تار کے فریم کی شکل کو تبدیل کریں اور پھر دیکھیں کیا ہوتا ہے۔

یہ بھی دنیا ہے

پھول ہی پھول

کبھی آپ نے کوئی پھول اُگایا ہے۔ اگر لگایا ہے تو اچھی بات ہے اور اگر نہیں لگایا تو اب ارادہ کرلیں کہ آپ ایک پھول کا پودا لگائیں گے۔ آپ پھول اُگائیں یا نہ اُگائیں، نیدرلینڈ میں رہنے والے پھول اُگانے میں مہارت رکھتے ہیں اور وہاں کا ایک باشندہ ایک سال میں تقریباً ۳ارب پھول اُگاتا بھی ہے اور بیچتا ہے۔ یہی وجہ ہے نیدرلینڈ میں ہر ایک اسکوائر کلومیٹر کے احاطے میں اسّی ہزار پھول لگے ہوئے ہیں۔
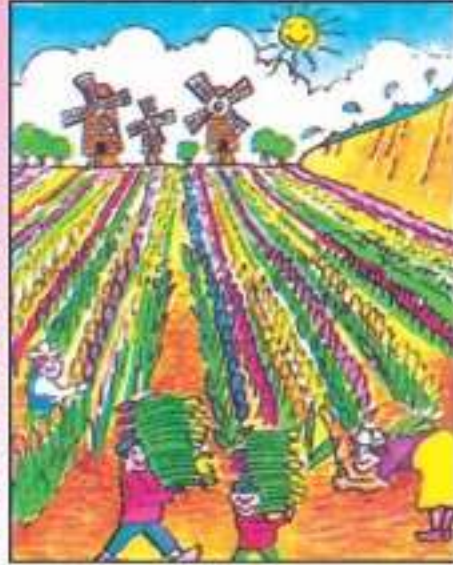
تیزی سے بڑھتا ہوا درخت

کرکٹ کے کھیل سے تو آپ واقف ہیں اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ کرکٹ میں استعمال ہونے والا بلا لکڑی سے بنتا ہے لیکن کیا آپ جانتے ہیں کہ لکڑی حاصل کرنے کا ایک اہم ذریعہ بانس کے درخت ہیں۔ بانس کا درخت تیزی سے بڑھتا ہے اور یہ ۹۰ سینٹی میٹر (۳۶ انچ) تک ایک دن میں بڑھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ بانس کا درخت تقریباً ۳۰ میٹر کا قد باآسانی حاصل کرلیتا ہے۔ یہ درخت سب سے زیادہ ہمارے پڑوسی ممالک بھارت اور چین میں پایا جاتا ہے۔

بچوں کا ہیرو......اشتیاق احمد

اعظم طارق کوہستانی

بچوں کے ادب میں ۲۰۱۵ء کا سال بڑا بھاری گزرا ہے، سعید لخت، عباس العزم، وقار محسن، عبدالقادر عارف اور اشتیاق احمد داعیِ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ ان تمام اشخاص کی بچوں کے لیے گراں قدر خدمات تھیں۔

اشتیاق احمد یوں سب سے منفرد رہے کہ وہ اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ مقبول رہے، تقریباً تیسری یا چوتھی نسل ان کے ناول پڑھ کر بڑی ہو رہی تھی۔ بچے ان کے ناولوں کے شیدائی ہیں۔ ساتھی کے قارئین کی طرف سے ہمیشہ یہ اصرار رہا کہ اشتیاق احمد کے ناول شائع کیے جائیں۔ تقریباً تین ناول اور متعدد کہانیاں ماہنامہ ساتھی کی زینت بنیں۔ اشتیاق احمد کون تھے؟ اور ان کی زندگی کے اہم نشیب و فراز آپ اس گوشے میں پڑھ سکیں گے۔

دنیا کے تمام قابلِ احترام بڑے لوگوں کی ذاتی زندگیوں میں جھانک کر دیکھیے آپ کو ایسی کئی چیزیں پوشیدہ نظر آئیں گی جو انھیں بڑا آدمی بناتی ہیں۔ اس شخصیت کی تعمیر میں کئی لوگوں کا ہاتھ ہوتا ہے

اوپر ہی اوپر اوج ثریا تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔اشتیاق احمد بھی ایسے ہی فرد تھے۔

800 ناولوں کے مصنف اشتیاق احمد صرف میٹرک پاس تھے۔ کچھ کرنے کے لیے روایتی تعلیم پیروں کی زنجیر نہیں بنی۔ اُنھوں نے صرف ابن صفی اور نسیم حجازی کو نہیں پڑھا بلکہ وہ کئی مغربی مصنفین کو بھی پڑھ چکے تھے۔ ماہنامہ ساتھی کو انٹرویو دیتے ہوئے اُنھوں نے کہا کہ وہ 'اگاتھا کرسٹی' اور 'اینیڈ بلیٹن' کو بھی پڑھ چکے ہیں۔

ان کے ناولوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ پوری دنیا میں شاید ہی کسی مصنف نے اتنی تعداد میں ناول لکھے ہوں۔ وہ لکھنے کی مشین تھے۔ اُنھوں نے لکھا اور بہت ہی اچھا لکھا۔ بچے، بڑے سب ہی ان کے ناولوں کے شیدائی تھے۔ اشتیاق احمد ایک دفعہ بتا رہے تھے کہ ایک دن اُنھوں نے اخبار میں پڑھا کہ دنیا کا سب سے تیز مصنف ایک منٹ میں اتنے الفاظ لکھ لیتا ہے۔ اشتیاق احمد صاحب نے بھی وقت نوٹ کر کے جب لکھا تو وہ الفاظ اس سے کہیں زیادہ تھے جو دنیا کا تیز ترین مصنف لکھتا تھا۔

جب ان سے دریافت کیا گیا کہ وہ گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں اپنا نام کیوں درج نہیں کرواتے تو کہنے لگے: ''ذاتی طور پر مجھے اس کا شوق نہیں مگر میرے بعض دوستوں کا خیال تھا کہ اس طرح پاکستان کا نام روشن ہوگا، اس کے لیے سلیم مغل (سابق مدیر آنکھ مچولی) نے کافی کوششیں کیں۔ مگر گنیز بک والوں کا کہنا تھا کہ ان سب ناولوں کے ٹائٹل کی ویڈیو بنا کر ہمیں بھیجی جائیں لیکن سب ناولوں کا ریکارڈ میرے پاس بھی موجود نہیں تھا۔ دوسری وجہ اشتیاق احمد نے یہ بتائی کہ اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ فلم کا خرچ اٹھا سکوں اس لیے یہ معاملہ رہ ہی گیا۔

ناولز تو اشتیاق احمد نے لکھے ہی لکھے۔ اس کے علاوہ بے شمار کہانیاں بھی وہ لکھ چکے تھے۔ یہ کہانیاں نونہال، بچوں کا اسلام، ماہنامہ ساتھی، ذوق وشوق اور ماہنامہ زادالفردوس میں شائع ہوتی تھیں۔ انھیں کئی ادبی ایوارڈز بھی مل چکے ہیں۔

اشتیاق احمد کی کہانیاں بچوں میں بے حد مقبول ہیں۔ ایک شخص کے دماغ میں بیک وقت اتنے سارے آئیڈیاز کیسے کلبلا سکتے ہیں۔ اس سوال کا جواب بھی اشتیاق صاحب نے ہمیں بتایا کہ ایک ڈائری ان کی جیب میں ہر وقت موجود رہتی ہے، جیسے ہی کوئی خیال ان کے ذہن میں آتا ہے۔ وہ اسے لکھ لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ لکھنے کے اوقات بھی ان کے مخصوص تھے۔ وہ ایک خاص وقت میں بیٹھ جاتے اور لکھتے رہتے۔ دن کے آٹھ دس صفحات کا کوٹا پورا کر کے اُٹھتے ...... دن کے آٹھ دس

صفحات لکھنا ان کے ابھی کا قصہ ہے۔ جوانی میں اس سے زیادہ ہی لکھا کرتے تھے۔

وہ کہتے تھے ادیب بننا آسان ہے جو جی میں آیا لکھ دیا لیکن مدیر بننا بہت مشکل ہے۔ بے شمار ڈاک میں سے ایک اچھی تحریر نکالنا ایسا ہے جیسے بھوسے میں سے سوئی نکالنا۔

وہ سب سے محبت کرتے تھے اور سب لوگ ان سے محبت کرتے ہیں۔ بک فیئر میں تین دن مسلسل ان سے ملتا رہا۔ میں نے کہا کہ بچوں نے ناک میں دم کر کے رکھا ہے۔ اشتیاق احمد کا انٹرویو کرنے کا کہتے ہیں۔

کہنے لگے: ''جب جی چاہے لے لینا۔''

میں نے کہا: ''ابھی تو آپ کے لیے بھی مشکل ہے۔ میں سوالات بھجوا دوں گا اور کچھ باتیں یہاں کرلوں گا۔ کہنے لگے: ''ہاں یہ ٹھیک ہے''۔ پھر اگلے دن خود یاد دلایا کہ سوالات بھجوا دینا۔ میں لکھ دوں گا۔

راقم اشتیاق احمد کو اپنی کتاب پیش کرتے ہوئے

خداداد صلاحیتوں کے مالک، ۸۰۰ ناولوں اور ہزاروں کہانیوں کے مصنف اشتیاق احمد نے صرف میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی۔ انھوں نے زندگی کی سختیاں برداشت کیں۔ لکھنے کی خداداد صلاحیت رکھتے تھے، میونسپل کارپوریشن لاہور میں ایک عرصے تک محض ۱۰۰ روپے ماہوار پر ملازمت کی جبکہ اس کے ساتھ ساتھ چھولا چاٹ کی ریڑھی بھی لگائی اور پان سگریٹ کا کھابھی چلایا۔ ۱۹۷۰ء میں میونسپل کارپوریشن میں ملازمت کے دوران کہانیاں لکھنا شروع کیں اور بہت کم عرصے میں مقبول لکھاری بن گئے۔ اُنھوں نے اپنا پہلا ناول صرف تین دن میں مکمل کیا۔ ان کی پہلی بیس کہانیاں بچوں کے لیے تھیں۔ اس کے بعد اُنھوں نے بڑوں کے لیے لکھنا شروع کیا جبکہ ان کی اپنی عمر ۶۰ سال تھی۔ ابتدا میں ان کی تحریریں رومانی ادب کا احاطہ کرتی تھیں، ان کی پہلی رومانی کہانی کا عنوان ''شمع'' تھا جو کراچی کے ایک رسالے میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد سیارہ ڈائجسٹ میں لکھنا شروع کیا۔ سیارہ ڈائجسٹ میں تین

میں نے ازراہِ مذاق کہا: ''یہاں آ کے تنگ ہو جاتے ہوں گے۔ سارا دن بچوں کا رش اور آٹو گراف......''
بیزاری سے کہا: ''اب نہیں آؤں گا۔ سارا دن بیٹھے رہو۔''
رات آٹھ بجے کے قریب آخری ملاقات ہوئی تو میں نے اگلے دن کھانے کی دعوت دی...... کہنے لگے کہ کل واپسی ہے صبح۔ مجھے کیا پتا تھا کہ وہ لاہور کی فلائٹ نہیں بلکہ ایک لمبی فلائٹ لے کر جانے والے تھے۔
بینا صدیقی ٹھیک ہی کہتی ہیں: ''ہم اشتیاق احمد کی تحریریں پڑھ کر بڑے ہوئے ہیں آج بھی ان کے ناولز پڑھ کر تفریح حاصل کرتے ہیں۔ بے شمار پبلشرز، ڈیلرز، سپلائرز حتیٰ کہ ردی والوں نے ان کے ناولز بیچ کر بہت پیسے کمائے لیکن وہ آخر وقت تک سفید پوش رہے۔''

اشتیاق احمد کا آخری ناول ''عمران کی واپسی'' تھا۔ یہ 800 واں ناول تھا جو اُنھوں نے فاروق احمد کی فرمائش پر لکھا تھا۔ میں نے پوچھا کہ اب عمران سیریز لکھنے کا ارادہ ہے۔ کہا کہ نہیں صرف یہ ایک ہی ناول لکھا ہے اور نہیں لکھنی عمران سیریز۔
ان کے جاسوسی ناولز نے بہت سارے بچوں کو پولیس کی راہ دکھائی۔ اسلام آباد کا آئی جی غلام رسول زاہد ان میں سے ایک ہے۔ اشتیاق احمد کے قلمی ناموں نے بھی بہت شہرت حاصل کی۔ جن میں عبداللہ فارانی، سرور مجذوب، ارشاد الٰہی وغیرہ شامل ہیں۔ ۱۷ نومبر ۲۰۱۵ء کو بچوں کے ادب کی تاریخ کا درخشندہ ستارہ ڈوب گیا۔ اللہ ان کی قبر پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔ آمین۔

☆......☆

چار کہانیاں شائع ہو گئیں تو اردو ڈائجسٹ میں لکھنے لگے۔ سیارہ ڈائجسٹ میں ۱۰۰ روپے ماہوار پر بطور پروف ریڈر کام کیا۔ ۱۹۷۱ء میں ایک رومانی ناول ''منزل انھیں ملی'' لکھا۔ ناول چھاپنے کے بعد پبلشر کی فرمائش پر بچوں کے لیے جاسوسی ناول لکھنے کا آغاز کیا اور پہلا ناول تین دن میں لکھا۔ اس ناول کے کردار محمود، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید تھے جنھوں نے اشتیاق احمد کو لافانی شہرت عطا کی۔ اشتیاق احمد کا پہلا ناول ''پیکٹ کا راز'' تھا۔ ناول نگار کے طور پر شناخت کے بعد شیخ غلام علی اینڈ سنز نے اپنے ماہ نامہ ''جگنو'' کی ادارت کے لیے ان کی خدمات مستعار لیں۔ اس دوران انھوں نے کہانیوں کی ۲۰۰ کتابیں لکھیں۔ ۸۰ کے عشرے میں شراکت پر طباعتی ''مکتبہ اشتیاق'' قائم کیا اور ہر ماہ ۴ ناول لکھ کر شائع کرتے رہے۔ بعد ازاں ''اشتیاق پبلی کیشنز'' کے نام سے اپنا الگ ادارہ قائم کیا اور اس کے لیے ہفتے میں ایک ناول لکھتے رہے۔

اشتیاق احمد کے عظیم کردار

محمد نعمان خان

جھنگ میں ظہر کی نماز ہو چکی تھی۔ نمازیوں کی تعداد معمول سے زیادہ تھی۔ لگتا تھا آج کسی کی نماز جنازہ بھی ہے، سب سے آگے کی صفوں کے پاس کچھ لوگ الگ تھلگ کھڑے نظر آئے۔

''آپ کون لوگ ہیں......؟ ادھر سے ہٹ جائیں۔ ابھی نماز جنازہ ہو گی۔'' ایک صاحب نے آگے بڑھ کر الگ تھلگ لوگوں کو مخاطب کرنا چاہا۔

''اگر آپ لوگوں کی اجازت ہو تو ہمیں پہلی صف میں جگہ مل سکتی ہے......؟ اور آپ کون ہیں...... اگر تعارف کرا دیں تو بات کرنے میں آسانی رہے گی۔'' ان میں سے ایک شخص نے انہی صاحب سے کہا جنھوں نے انھیں ٹوکا تھا۔

''جی...... میں مرنے والے کا پبلشر ہوں یہ تو آپ جانتے ہی ہیں وہ معروف ادیب تھے لیکن آپ ہیں

کون......؟ جگہ تو مل جائے گی لیکن آپ لوگ کافی زیادہ نہیں ہیں......؟'' پبلشر نے جواب دیا۔

خوب صورت آدمی کچھ دیر تو خاموش رہا پھر مخاطب ہوا۔'' جی میں انسپکٹر جمشید ہوں اور یہ سب میرے ساتھ ہیں، یہ دائیں جانب انسپکٹر کامران مرزا، پروفیسر داؤد، خان رحمان، فاروق، محمود، آصف، آفتاب بائیں جانب شوکی برادرز ہیں۔ ہم سب بھی نماز جنازہ میں شرکت کرنا چاہتے ہیں اگر آپ لوگ اجازت دے دیں تو......؟'' انسپکٹر جمشید کے اس جملے سے چند ثانیے کے لیے خاموشی چھا گئی، لوگ اُنھیں ایسے دیکھ رہے تھے جیسے انھیں یقین نہ آیا ہوا۔ جن کے متعلق وہ کئی دہائیوں سے پڑھ رہے تھے وہ سب کرداران کی نظروں کے سامنے تھے۔ کچھ لوگوں نے تو اپنی آنکھوں کو مسل کر بھی دیکھا کہ کہیں وہ کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہے۔

اریب قریب کی صفوں میں ہلچل سی مچنے لگی۔ لوگوں کی آنکھوں میں بے یقینی کا عنصر نمایاں تھا، پھٹی پھٹی نگاہیں ان کا طواف کر رہی تھیں، لوگوں کی آنکھوں میں ایسی حیرت تھی جیسے وہ کوئی عجوبہ ہوں۔ پانچ چھے افراد اوران کے قریب آ گئے انھوں نے اپنا تعارف کرایا کہ وہ بھی انتقال کرنے والے ادیب کے پبلشر ہیں۔ ہلچل دیکھ کر قریب کھڑے ہوئے انسپکٹر کامران مرزا بولے:'' بھائیو! پریشان نہ ہوں، ہم سب آپ کے سامنے ہی کھڑے ہیں، تحمل سے کام لیجیے کہیں افراتفری میں کوئی حادثہ نہ ہو جائے۔ بس کچھ دیر کی بات ہے پھر ہم چلے جائیں گے۔''

'' لل......لل......لیکن آپ لوگ ہمیں جیتے جاگتے کیوں محسوس ہو رہے ہیں...... آپ تو فرضی کردار تھے......؟'' ایک شخص آگے بڑھ کر بولا۔ اس کے چہرے پر دنیا جہان کی حیرت تھی۔

'' جی ہاں...... ہم فرضی کردار ہیں جو اکثر آپ کو ناولوں میں ملا کرتے تھے......بس......آج آخری بار ہم آپ کے پاس ہیں، کیونکہ ہمیں تخلیق کرنے والا لافانی کردار بنانے والا اس دنیا سے جا چکا ہے، کچھ ہی دیر میں اس شخص کے ساتھ ہم بھی چلے جائیں گے۔'' انسپکٹر کامران مرزا نے جواب دیا۔

''نہیں......ایسا نہیں ہوسکتا، آپ کیوں چلے جائیں گے......آپ نے تو بہت کام کیا ہے۔'' ایک شخص نے بولنا شروع ہی کیا تھا کہ انسپکٹر جمشید نے انھیں اشارے سے روک دیا۔'' آپ سب سے ہمیں دو باتیں کرنی ہیں۔'' انسپکٹر جمشید نے ایک نظر مجمع پر دوڑائی پھر دوبارہ کہنے لگے''موت برحق ہے...... ہر نفس کو ایک نہ ایک دن موت آنی ہے۔ ہر شخص کا اختتام ہوتا ہے۔ آج ایک ادیب اس دنیا سے جا چکا ہے لیکن اس کی یادیں تاحیات آپ لوگوں کے سینوں میں رہیں گی۔ کیونکہ اچھے لوگ بظاہر دنیا سے چلے

جاتے ہیں درحقیقت وہ لوگوں کے دلوں پر راج کیا کرتے ہیں۔''

انسپکٹر جمشید اپنی عادت کے مطابق رُکے اور ایک بار پھر مخاطب ہوئے: ''ہر انسان ایک کردار ہے، کوئی اچھا کوئی بُرا...... تمام انسان اس دنیا میں ایک مقصد کے لیے بھیجے گئے ہیں لیکن اس مقصد کی تکمیل انسان بھول چکے ہیں۔ معاشرہ بے راہ روی کا شکار ہے۔ چند دہائی قبل اشتیاق احمد صاحب نے ہماری نشوونما شروع کی، آپ لوگوں کے لیے ہمارے کردار سنوارے، ہمیں وہ بنانے کی اُنھوں نے کوشش کی جو وہ اس قوم کو دیکھنا چاہتے تھے۔ لوگوں کی نظر میں یہ ادنیٰ کوشش تھی لیکن درحقیقت یہ ایک ایسا تناور درخت بن گئی جو ان شاء اللہ ہماری نسلوں کو پھل دیتا رہے گا۔ ان کے ناولوں میں ہماری دشمنوں سے لاتعداد لڑائیاں ہوئیں جس میں ہمیں سرخرو دکھایا گیا۔ کہنے کو وہ سب دشمن معمولی کردار تھے مگر رفتہ رفتہ یہ کردار ہماری نسلوں میں منتقل ہونا شروع ہو گئے۔ عام شہری پولیس کو دیکھ کر گھبراتا ہے لیکن جب وہ ہمارے متعلق پڑھتا ہے تو اس کے دل میں انسپکٹر جمشید بننے کی لگن جاگتی ہے ہمارے کردار دیکھ کر ہی کئی نوجوان پولیس میں بھرتی ہوئے، اشتیاق صاحب نے ہمیشہ ہمارے کرداروں کے ذریعے نیکی کا درس دیا۔ اکثر مواقع پر جب کسی دشمن سے ہماری ہار یقینی ہو جایا کرتی اس وقت بھی وہ ہمیں اور پڑھنے والوں کو اُمید کی کرن دکھا دیا کرتے۔ لوگوں کو مایوسی سے بچاتے۔ دشمن کا مقابلہ کرتے ہوئے بھی انسانیت کو اجاگر کرتے تاکہ دوست تو دوست دشمن بھی مسلمانوں کا گرویدہ ہو جائے۔''

ایک بار پھر انسپکٹر جمشید چند ثانیے کے لیے خاموش ہوئے پھر انھوں نے دوبارہ سلسلہ کلام جوڑا ''میرے بھائیو! مجھے اور میری پوری ٹیم کو اشتیاق صاحب پر فخر ہے کہ انھوں نے ہمارے ذریعے لوگوں کی صحیح ذہن سازی کی، ہمیں اُنھوں نے آپ کے لیے رہنما بنایا۔ ہمیں ملک کا وفادار سپاہی، غازی اور نیکیوں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے والا بنایا۔ میری آپ سب سے گزارش ہے کہ آپ لوگ اپنے بچوں کو دین کا سپاہی بنائیں تاکہ وہ اچھے برے کی تمیز کر سکیں، دین کے دشمنوں سے لڑ سکیں، ملک و قوم کے کام آئیں، ان کے اندر دوسرے کا درد پیدا ہو، بدی سے لڑنے کی طاقت ہو، ہم سب کو اپنی صفوں میں چھپی کالی، بھیڑوں کی پہچان ہو جائے بس...... یہی اشتیاق صاحب چاہتے تھے۔'' اتنا کہہ کر انسپکٹر جمشید خاموش ہو گئے۔ پورا مجمع خاموش تھا شاید لوگ خود سے عہد کر رہے تھے۔

کچھ دیر بعد جسد خاکی لایا گیا۔ صفیں بنیں اور نماز جنازہ پڑھائی گئی۔ نماز جنازہ کے بعد لوگ جوق در جوق جنازے کی جانب بڑھے اور جنازے کو اٹھا کر

آخری آرام گاہ کی جانب لے جانے لگے۔

انسپکٹر جمشید، انسپکٹر کامران کی ٹیم وہیں کھڑی رہی۔ رفتہ رفتہ میدان خالی ہونے لگا۔ کچھ بوڑھے لوگ جو جنازے کے ساتھ جا نہیں سکتے تھے انھوں نے دیکھا کہ آہستہ آہستہ انسپکٹر جمشید کی ٹیم دھندلی ہوتی جارہی ہے۔ مدہم ہوتے ہوتے یہ سب کردار منظر سے غائب ہوگئے۔ اب میدان خالی تھا۔

عظیم ادیب اپنے ساتھ عظیم کردار بھی لے گیا۔ شیکسپیئر نے کہا تھا "یہ دنیا ایک اسٹیج ہے ہر شخص آتا ہے اور اپنا کردار نبھا کر چلا جاتا ہے۔" اشتیاق صاحب بھی آئے تھے، اپنا کردار نبھایا اور بہت خوبصورتی سے نبھایا اور خاموشی سے چلے گئے...... مگر ان کے کردار لوگوں کے دلوں پر آج بھی راج کرتے ہیں، آج بھی ان کے چاہنے والے ان کے کرداروں میں ڈھلنا چاہتے ہیں۔ عظیم لوگوں کی یہی پہچان ہوا کرتی ہے وہ نہیں ہوتے لیکن ان کے لگائے گئے پودے ان کے لیے صدقہ جاریہ اور ان کے چاہنے والوں کے لیے سایہ دار درخت بن جایا کرتے ہیں۔ الوداع...... اشتیاق احمد! الوداع......!!

☆......☆

اشتیاق احمد اپنی کہانی "میری کہانی" میں لکھتے ہیں......

زندگی میں مجھے حیرت کا قدم قدم پر سامنا ہوا ہے۔ پہلی کہانی لکھی اور چھپ گئی۔ دوسری کہانی لکھی، وہ بھی چھپ گئی۔ تیسری کہانی لکھی، وہ بھی چھپ گئی۔ اب میں حیران نہ ہوتا تو کیا کرتا۔ اس طرح میرا اور حیرت کا چولی دامن کا ساتھ ہوگیا اور یہ ساتھ روز بروز پختہ ہوتا گیا۔ انہی دنوں میونسپل کارپوریشن میں ملازمت مل گئی، لیکن تنخواہ صرف 100 روپے تھی۔

اوپر تلے پندرہ بیس کہانیاں شایع ہوگئیں تو جی میں آئی کہ بچوں کے لیے بہت کہانیاں لکھ لیں، اب بڑوں کے لیے لکھنا چاہیے حالاں کہ خود ابھی سولہ سال کا تھا، لیکن سوچنے سمجھنے کی عمر کہاں تھی۔ رومانی کہانی لکھ ماری۔ اب فکر ہوئی، اسے شایع کیسے کراؤں۔ ان دنوں کراچی سے ایک رسالہ نکلتا تھا۔ شمع کراچی۔ اس میں رومانی افسانے شایع ہوتے تھے۔ انہیں افسانہ بھیج دیا۔ انہوں نے وہ شایع کردیا۔ اوپر تلے چھ سات افسانے انہیں لکھ کر ارسال کردیے، انہوں نے سب کے سب شایع کردیے۔ ایسے میں سیارہ ڈائجسٹ شروع ہوا۔ انہوں نے کہانیوں کا معاوضہ دینے کے اشتہارات شایع کیے تو سوچا چلو ان سے کچھ پیسے ہی مل جائیں گے۔ انہیں ایک افسانہ بھیج دیا۔ افسانہ شایع ہوگیا اور ساتھ ہی مدیر معاون اظہر جاوید صاحب کا خط بھی آگیا کہ اور لکھ کر ارسال کریں۔"

اور اس طرح ان کے قلمی سفر کا آغاز ہوا جو ان کی زندگی کے آخری دن تک جاری رہا۔
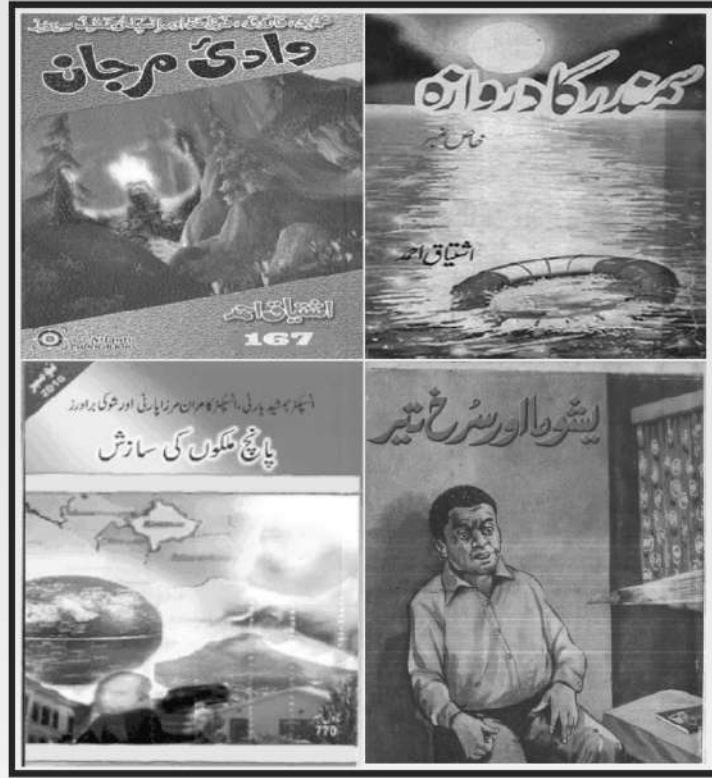
ارباب چمن مجھ کو بہت یاد کریں گے

فوزیہ خلیل

اشتیاق احمد بچوں کے جاسوسی ادب کے بانی بھی تھے اور بام عروج پر لے جانے والے بھی۔ اس فن میں کوئی ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکا۔ کہانیوں کا تو ریکارڈ ہی مرتب نہیں۔ بیسیوں رسائل میں شائع ہونے والی ہزاروں کہانیوں کا ریکارڈ کون رکھ سکتا ہے۔ خود ان کو بھی نہ اس کی فکر تھی نہ کبھی کوشش کی اور کہانیاں بھی ایسی کہ ہر کہانی لاجواب۔ بے مثال۔ قاری خود کو ان کی کہانیوں کے ساتھ چلتا پھرتا، دوڑتا بھاگتا، روتا رُلاتا اور ہنستا مسکراتا محسوس کرتا۔

زندگی میں پہلی بار کسی مصنف کی رحلت پر خلق خدا کو اس قدر افسردہ پایا۔ اس سے پہلے بھی ایسا ہوا ہوگا لیکن میں نے عقیدت و احترام کا یہ منظر پہلی مرتبہ دیکھا۔ بچے تو بچے، بڑے بوڑھے تک اُن سے انتقال پر یوں افسردہ تھے جیسے یہ ان کے گھر کے کسی فرد ہی کی موت ہو۔

میں نے جب ہوش سنبھالا تو اپنے گھر میں اپنی خالاؤں اور ماموں کو اشتیاق احمد کے ناول پڑھتے ہوئے پایا۔ اسکول میں بھی تقریباً تمام بچے ان کے ناولوں کے دیوانے تھے۔ بچپن سے لڑکپن کا تمام عرصہ ان کے ناول پڑھتے گزرا۔ دل میں یہ خواہش

انگڑائی لیتی کہ کاش کبھی زندگی میں اُن سے بات ہی کرسکوں مگر فوراً ہی یہ خیال آتا کہ وہ عام افراد سے بھلا کب بات کریں گے۔

مجھے یاد ہے دسمبر ۲۰۰۷ء میں پہلی مرتبہ میری کہانی ''بچوں کا اسلام'' میں چھپی تھی اور چند ہی دن کے بعد فون آیا تھا۔''السلام علیکم۔ میں اشتیاق احمد بول رہا ہوں۔امید کروں گا آپ ہمارے رسالے میں مستقل لکھتی رہیں گی۔'' اور پھر کہانیوں کے لیے اکثر ان کا فون آتا۔ جب بھی فون پر بات ہوتی اُن کی بے ساختہ اور زوردار ہنسی طبیعت پر خوشگوار اثر چھوڑ دیتی تھی۔'' لہجے میں اتنی شفقت، اتنی حوصلہ افزائی اتنی سادگی۔کیا کیا بھلایا جائے۔ بھلا یہ بھولنے والی باتیں ہیں۔الفاظ ہی نہیں جو دلی کیفیت کی ترجمانی کرسکیں مگر جانے والوں کو کون روک سکتا ہے جو آیا ہے اس نے جانا بھی ضرور ہے۔

ساتھی کے ۲۰۰۹ء کے مشاعرے میں پہلی مرتبہ اُن سے ملاقات ہوئی اور مشاعرہ کے اگلے ہی دن وہ ہمارے گھر قاری عبدالرحمٰن (سابقہ مدیر روزنامہ اسلام) کے ساتھ دوپہر کے کھانے پر تشریف لائے۔ خاندان کے بہت سارے لوگ اس دن ہمارے گھر جمع تھے۔سب ہی اس عظیم شخص کو دیکھنے کے خواہش مند تھے جس کا قلم سحر اُگلتا تھا۔اس قدر عاجزی اور اس قدر انکساری۔

گھر میں کوئی بیمار ہوتا تو خیریت پوچھنے کے لیے بار بار فون کرتے۔اکثر ہومیو پیتھک دوا خود تجویز کرتے اور فائدہ ہوجاتا تو بہت خوش ہوتے۔

۱۴نومبر (ہفتہ) ۲۰۱۵ء کو دوپہر میں اُن سے فون پر بات ہوئی اور اگلے دن ملاقات کا پروگرام طے ہوا۔ رات کو پھر دس بجے ان کا فون آیا کہ میں ابھی ایکسپو سے آ رہا ہوں اور کل کے آنے کی یاد دہانی کروا رہا ہوں۔

میں نے عرض کیا:''کل تو آپ کو دارالعلوم کورنگی جانا ہے۔''

بولے:''نہیں۔ میں دوپہر بارہ بجے وہاں سے نکلوں گا تو دارالعلوم سے نکلتے ہی آپ کو فون بھی کردوں گا۔''

اگلے روز ۱۵نومبر (اتوار) ٹھیک بارہ بجے دوپہر ان کا فون آیا کہ میں دارالعلوم کورنگی سے نکل چکا ہوں آپ لوگ بھی گھر سے روانہ ہوجائیں۔وہ جب بھی کراچی تشریف لاتے۔ قاری عبدالرحمٰن کے گھر پر قیام فرماتے۔ ہم انہی کے گھر گئے تھے۔ دوپہر اڑھائی بجے تک کا وقت ہم نے ان کے ساتھ گزارا۔ اپنی جیب میں سے ڈائری نکالی اور اس ڈائری کا ورق پھاڑ کر مجھے بچوں کے لیے کچھ ہومیو پیتھک ادویہ کے نام لکھ کر دیے۔ ٹھیک اڑھائی بجے گاڑی ان کو لینے آ گئی۔ہم سب ساتھ ساتھ سیڑھیاں اُترے تھے۔وہ

ایکسپو روانہ ہو گئے تھے۔ وہ آخر وقت تک اپنی گاڑی سے ہم کو الوداعی ہاتھ ہلاتے رہے یہاں تک کہ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اگلے روز ۱۶ نومبر (پیر) دوپہر پھر ان کا فون آیا۔ کسے معلوم تھا یہ آخری گفتگو ہے۔ ۱۷ نومبر (منگل) کو قاری عبدالرحمٰن کی صاحبزادی کا دو بج کر انتیس منٹ پر پیغام آیا کہ ایئرپورٹ پر اُن کی طبیعت بگڑ گئی ہے دعا کریں اور دو بج کر اڑتیس منٹ پر انتقال کا پیغام آ گیا۔

یہ کیسی موت تھی۔ ایسی موت تو اللہ تعالیٰ کے ولیوں کو نصیب ہوتی ہے۔ طویل العمری اور ضعیف البدنی کے باوجود چلتے پھرتے ہنستے مسکراتے۔ تین نسلوں نے ان کے ناولوں سے فیض اٹھایا۔ انھوں نے ملک و مذہب سے محبت کرنا سکھایا۔ ساری عمر بچوں کے لیے لکھا اور بچوں سے ایسی محبت کہ ابدی نیند کے لیے بھی ان کو ننھے منے بچوں کے جھرمٹ میں جگہ ملی ان کی قبر کے اطراف چھوٹے چھوٹے بچوں کی قبریں ہیں۔

کیا اُن کے بعد کوئی ایسا مصنف ہے جس کی تفریحی کتب ہم بلا جھجک اپنے بچوں کے ہاتھوں میں دے سکیں؟ جن میں مشرقی تہذیب اور شائستگی کا پورا پورا خیال رکھا جاتا ہو۔

ارباب چمن مجھ کو بہت یاد کریں گے
ہر شاخ پر اپنا ہی نشاں چھوڑ رکھا ہے

☆......☆

نئے کرداروں کا بانی

سال ۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۰ء کی دہائیوں میں جب موبائل فون اور کمپیوٹر نہیں تھا اسکول اور کالج کے طلبہ و طالبات کی تفریح کا بڑا ذریعہ جاسوسی ادب تھا۔ رات کو بستر میں بیٹھ کر ان ناولوں میں بیان کی گئی حب الوطنی کی کہانیوں میں گم ہونے کا اپنا ہی مزہ ہوتا تھا۔ دشمن ملک کے جاسوسوں کو جب کوئی پاکستانی پولیس یا خفیہ ایجنسی کا افسر ناکام بناتا تو پڑھنے والوں کا دل باغ باغ ہو جاتا اور ناکامی کی صورت میں چہرے پر افسردگی آ جاتی۔

ان ناولوں کو خریدنے کے لیے کوئی جیب خرچ کو بچا کر رکھتا تو کوئی لائبریری سے ایک روپیہ روزانہ کرائے پر حاصل کر لیتا۔ پاکستان میں جاسوسی ادب کے بانی اسرار احمد ابن صفی کی وفات کے بعد جاسوسی ناول نگاروں کے قبیلے کے سردار اشتیاق احمد تھے۔ ابن صفی کے بعد مظہر کلیم اور صفدر شاہین نے بھی علی عمران، جولیا اور ایکس ٹو کے کرداروں کو ہی اپنے ناولوں میں مرکزی جگہ دی تھی مگر اشتیاق احمد بالکل نئے کرداروں کے ساتھ جاسوسی ادب میں سامنے آئے، ان کرداروں میں انسپکٹر جمشید، محمود، فاروق، فرزانہ، انسپکٹر کامران مرزا اور شوکی جیسے اچھوتے کردار موجود تھے۔

ان ناولوں کی زبان اتنی آسان اور کہانی کا پلاٹ اتنی عمدگی سے بنا ہوا ہوتا تھا کہ پڑھنے والے نوجوان ناول کے ماحول کا ایک حصہ بن جاتے تھے، پنجاب کے چھوٹے سے شہر جھنگ میں ۱۹۴۱ء میں پیدا ہونے والے اشتیاق احمد نے اپنا پہلا جاسوسی ناول ۱۹۷۳ء میں لکھا، جو اتنا مقبول ہوا کہ نئے ابھرنے والے مصنف کے قلم نے ہر ماہ کم از کم ایک نیا ناول اُگلنا شروع کر دیا۔ ہر ناول ایک اچھوتے خیال کا حامل ہوتا تھا۔

پوٹھوہاری سے ترجمہ

ٹنکو

الیاس بابر اعوان

ٹنکو جاگا، بیگ اٹھایا
گاڑی آئی، سیٹ پہ بیٹھا
اور اسکول میں دیر سے پہنچا
ٹیچر بولا، کام دکھاؤ
کام دکھایا، ڈنڈا کھایا
ٹنکو بھاگا، گھر کو آیا
بیٹ اٹھایا، باہر آیا
لڑکے بالے ساتھ لگا کر
کرکٹ کھیلی، وقت گنوایا
شام کو واپس گھر کو آیا
ٹی وی دیکھا، گیمیں کھیلیں
بھائی سے سارا کام کرایا
دیر سے سویا، دیر سے جاگا
بیگ اُٹھایا، گاڑی آئی
سیٹ پہ بیٹھا، دیر سے پہنچا
ٹیچر بولا، کام دکھاؤ
کام دکھایا، ڈنڈا کھایا

خطرناک منصوبہ

اُمِ ایمان

پیپل کے درخت پر قبضہ کرنے کے لیے ایک منصوبہ بنایا گیا

ساون کا مہینہ تھا۔ سورج کی روشنی ہلکی ہوتی جارہی تھی کیونکہ بادل چھارہے تھے۔ لگ رہا تھا کہ بارش خوب زور سے برسے گی۔ سفید کبوتر نے پیپل کی شاخ پر بیٹھ کر اردگرد کا جائزہ لیا۔

دور دور تک اسے کوئی پرندہ اُڑتا ہوا نظر نہیں آرہا تھا۔ نہ کوے نہ ہی فاختائیں۔ نہ مینا نہ نیل کنٹھ۔ نہ بلبل اور نہ ہی چیل لگتا تھا کہ اس پورے جنگل میں کوئی پرندہ ہی نہیں رہتا۔ ایسا بھلا کیسے ہوسکتا ہے؟

اتنا ہرا بھرا جنگل اور کوئی پرندہ یہاں نہ رہتا ہو۔ دراصل سب اپنے اپنے گھونسلوں میں ہیں۔ ایسے موسم

میں کوئی میری طرح بیوقوف تھوڑی ہے کہ باہر نکلے......سفید کبوتر نے دل ہی دل میں سوچا۔
میں کہاں جاؤں میرا تو گھونسلہ دور ہے۔ اگر بارش ہوگئی تو ایسا سایہ دار اور گھنا درخت پتا نہیں ملے یا نہیں......بہتر ہے کہ میں یہیں ٹھہر جاؤں۔
اس نے گردن دوبارہ گھما کر اردگرد دیکھا......جس شاخ پر وہ بیٹھا تھا اس کے تنے کے ساتھ ایک سوراخ نظر آرہا تھا۔ یہ پتا نہیں کس کا گھر ہے۔ وہاں سے ذرا ہٹ کر نیچے کی جانب بھی کسی گھونسلے کے آثار نظر آرہے تھے۔ لیکن خاموشی تھی۔ کبوتر نے ذرا ڈر کر دوسری طرف والی شاخ پر پنجے جمائے۔ گردن گھما گھما کر دونوں طرف دیکھا......تقریباً ہر شاخ اور اس کے ساتھ تنے میں گھونسلوں کے تنکے نظر آرہے تھے تنے میں سوراخ بھی تھے لیکن بہت خاموشی تھی۔ کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔
چلو چھوڑو زیادہ نہ سوچو...... کچھ دیر آرام کرلوں ذرا سورج بادلوں کی اوٹ سے نکلے تو پھر اپنے گھونسلے کا رخ کروں۔
کبوتر نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا۔ ذرا سکون سے بیٹھ کر اس نے اپنی چونچ اپنے پروں میں کرلی۔
''چوں چوں...... چوں چوں...... کبوتر ماموں...... کبوتر ماموں۔'' کبوتر کے کانوں نے یہ آواز سنی۔
''ارے بھئی کون ہے؟'' کبوتر نے چوکنا ہوکر پروں سے چونچ نکالی۔
''میں یہاں ہوں اِدھر......''
اوپر کی کوئی شاخ تھی جہاں سے آواز آرہی تھی۔ تنے کے ساتھ لگا ہوا گھونسلہ بلکہ اتنا چھپا ہوا گھونسلہ تھا کہ پہلی نظر میں تو نظر بھی نہیں آتا تھا۔ تنے کے سوراخ کے اندر جو بنا ہوا تھا۔
یہ ایک ننھا فاختہ کا بچہ تھا۔ پر نکلے ہوئے تھے لیکن پھر بھی چھوٹا ہی تھا۔
''کیا ہوا فاختہ کا بچہ! تمھارے والدین کہاں ہیں اور باقی گھونسلوں کے رہنے والے بھی نظر نہیں آرہے، آخر کہاں گئے ہیں سب کے سب؟''
''پتا نہیں ابھی کل تک تو سب ہی اپنے اپنے گھروں میں موجود تھے۔ صبح میری آنکھ کھلی تو کوئی نہیں تھا......''
''یہ کیسے ہوسکتا ہے تمھارے والدین بغیر بتائے تم کو چھوڑ کر چلے گئے۔''
''اصل میں ہوا یہ کہ پرسوں بندر چچا آئے تھے وہ کافی دیر سب بڑوں کے ساتھ بیٹھے رہے۔ کسی خطرے کا ذکر کررہے تھے کہ ایک دو دن کے اندر اس درخت پر کسی خطرناک بلا کا حملہ ہونے والا ہے خیریت چاہتے ہو تو سب کے سب یہاں سے دور چلے جاؤ۔''
''اچھا اگر تمھارے کہنے کے مطابق سب کے سب کسی بلا کے ڈر سے گھروں کو چھوڑ کر چلے گئے تو تم کو کیوں

چھوڑ گئے؟"

"اصل میں میری سستی اور کاہلی وجہ ہے۔" ننھا فاختہ شرمندگی سے بولا۔

"کیا مطلب؟"

"میں رات دیر تک جاگتا رہا جس کی وجہ سے صبح میری آنکھ نہیں کھلی۔ صبح کا ناشتہ بھی بند آنکھوں سے کیا اور پھر اپنے نرم گرم پتوں والے بستر پر لڑھک گیا۔ یاد نہیں کہ کس وقت سب کے سب نکل گئے۔ ابا کہہ تو رہے تھے کہ جلدی کرو جلدی کرو...... لیکن پتا ہی نہیں چلا سب کے سب چلے گئے۔" ننھے فاختہ کا منہ اُترا ہوا تھا۔

"چلو منے فکر نہ کرو میں ہوں ناں! تمھارا ماموں......"

کبوتر کو کسی نے پہلی دفعہ ماموں بنایا تھا اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ کبوتر ماموں بن کر شفقت کے ساتھ فاختہ کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

"کبوتر ماموں مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ ابا تو اس وقت تک دانہ لے کر آ جاتے تھے لیکن آج وہ کہاں آ ئیں گے؟"

کبوتر سوچ میں پڑ گیا۔ ننھے فاختہ کے لیے اس وقت دانا کہاں سے لایا جائے۔

"تم آج ان چونٹیوں پر گزارا کرو۔" چند چونٹیاں مری ہوئی تنے کے ساتھ ہی پڑی تھیں۔ کبوتر نے لائن بنا کر جاتی چونٹیوں کی طرف اشارہ کیا۔

"اونہہ!! مجھے یہ اتنی پسند نہیں...... آپ ایسا کریں یہ ساتھ والے تنے میں ایک گلہری کا گھر ہے اس نے وہاں ضرور کچھ جمع کر کے رکھا ہوگا آپ مجھے وہ لادیں۔"

"نہ بھئی! میں بغیر پوچھے کسی کے گھر سے چیز کیسے لے سکتا ہوں۔"

"چھوڑیں ماموں یہ آپ اپنے لیے تھوڑی لے رہے ہیں۔ یہ تو آپ اپنے بھانجے کی زندگی بچانے کے لیے لے رہے ہیں۔"

کبوتر سوچ میں پڑ گیا آخر اس کو ننھے فاختہ پر ترس آ گیا اور اس نے گلہری کے گھر میں جھانک کر دیکھنے کا ارادہ کیا۔ قریب گیا تو دیکھا کہ گلہری کی ننھی بچی تنے کے سوراخ میں سے جھانک رہی ہے۔

"ارے منی تم گھر میں تنہا ہو؟"

"کبوتر ماموں پتا نہیں اماں کہاں رہ گئیں؟ ویسے اس وقت تک آ ہی جاتی ہیں۔"

"اچھا آپ فاختہ بھیا کو یہ روٹی کا ٹکڑا دے دیں نرم ہے کل ہی اماں کہیں سے لائی تھیں۔"

"منی تم اماں سے پوچھے بغیر یہ ٹکڑا دے رہی ہو وہ ناراض نہیں ہوں گی۔"

"نہیں فاختہ بھیا بھوکے ہیں ان کی زندگی کا سوال ہے آپ انھیں یہ کھانے کے لیے دے دیں۔"

کبوتر منی گلہری کی سمجھداری پر حیران بھی تھا اور خوش

بھی...... ساتھ ہی فکر مندی بھی تھی کہ ننھے فاختہ کے ساتھ ننھی گلہری کی ذمہ داری بھی آن پڑی تھی۔
اس نے سوچ لیا تھا کہ ان دونوں ننھے بچوں کو محفوظ ہاتھوں میں دیے بغیر اب وہ اپنے گھونسلے کا رخ نہیں کرے گا کہ یہ تو بڑی خود غرضی ہو جائے گی۔
پتا نہیں کس وقت سب کے سب سو گئے۔ صبح تڑکے چہچہاہٹ کی آواز پر سب سے پہلے فاختہ اُٹھا۔ یہ آواز دور سے آرہی تھی۔
کبوتر ماموں اُٹھے۔ حمد کا وقت ہو گیا۔ سب پرندے صبح چہچہاتے ہیں۔ اپنے رب کی تعریف کرتے ہیں۔
کبوتر جلدی سے اُٹھا۔
آوازوں سے اسے یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ سارے پرندے اب کہاں ہیں۔ ابھی وہ اُڑنے کے لیے پر تول ہی رہا تھا کہ گلہری اماں ہانپتی کانپتی دوڑتی ہوئی پیپل کے درخت پر آ گئیں۔
ننھی گلہری ماں کو دیکھ کر خوشی کے مارے اچھلنے لگی۔
لپک کر اماں کی پھولی ہوئی دُم پر دھم سے گری اور لپٹ گئی۔ گلہری اماں نے اس کو نرمی سے سنبھالا...... گلا تو ایسا خشک تھا کہ کچھ بولا نہیں جا رہا تھا۔
کبوتر نے پتوں پر جمع شبنم گلہری کے منھ میں ڈالی تو اس کے دم میں دم آیا۔ کبوتر اور فاختہ دونوں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔
''کبوتر بھیا کیا بتاؤں کیا سن کر آرہی ہوں اور کیا دیکھ کر آرہی ہوں......''
''اب بتا بھی چکو، مجھے بھی اپنے گھونسلے میں جانا ہے۔''
ارے بھیا یہ بندر ماسٹر کا منصوبہ تھا۔ اُلّو اور چمگادڑ کو ساتھ ملا کر اس پیپل کے درخت پر مکمل قبضے کا منصوبہ ایسا سایہ دار آرام دہ پیپل کا درخت پورے جنگل میں نہیں ہے۔ پھر یہاں سارے گھونسلے بہت مضبوط بنے ہوئے ہیں ان میں پرندوں کے انڈے بھی ہیں۔
پھر ساتھ ہی شہتوت کے درخت کی وجہ سے ہر طرح کے کیڑے مکوڑے با آسانی مل جاتے ہیں۔ شہتوت کے مزے الگ ہیں۔
یہ سب سوچ کر تینوں کم ظرفوں اور خود غرضوں نے یہ منصوبہ بنایا ہے۔ آج رات تک وہ اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ اس درخت پر ڈیرا جمالیں گے۔ پھر انھیں کوئی یہاں سے ہٹا نہ پائے گا۔ وہ تو بارش ہوئی تو ذرا دیر ہوگئی۔ آؤ کبوتر بھیا سارے پرندوں کو واپس بلا لائیں۔''
کبوتر نے اُڑان بھری اور گلہری بھی اس کے پیچھے آہستہ آہستہ دوڑتی ہوئی گئی۔ ذرا سی دیر میں سارے پرندے جھنڈ کے جھنڈ پیپل کے درخت پر تھے۔ اپنے اپنے گھونسلوں میں سب نے سکھ کا سانس لیا۔ لیکن ابھی ایک مرحلہ باقی تھا۔
بندر اُلّو اور چمگادڑ اپنے منصوبے کی ناکامی پر ٹھنڈے

ٹھنڈے تو بیٹھنے والے نہیں تھے۔
سب بڑے مل کر غور کرنے لگے کہ معاملہ کیسے نمٹایا جائے۔ فاختہ، مینا، توتے، نیل کنٹھ، بھوری چڑیا، کوے سب پر جوش تھے، متحد تھے، ساتھ ہی سفید کبوتر کے شکر گزار تھے۔ جس نے انھیں یہاں واپس آنے پر آمادہ کیا۔ خاص طور سے ننھے فاختہ کے والدین تو بہت زیادہ شکر یہ ادا کر رہے تھے۔
''دیکھیے آپ لوگ اس وقت ٹھان لیں کہ اپنے درخت پر کسی غیر کو قبضہ کرنے نہیں دیں گے آپ اگر متحد ہوں گے تو کسی کی مجال نہیں کہ آپ کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے۔''
گلہری اس معاملے میں خاموش تھی لیکن اب وہ بولی کہ آپ لوگ اگر کہیں تو 'چیل کمانڈوز' کو بلا لاؤں اگر چہ ان کا ٹھکانہ دور ہے لیکن آپ کہیں تو میں ابھی روانہ ہو جاتی ہوں۔
سب پرندے یہ سن کر خوش ہو گئے۔ لیکن کبوتر پھر بولا: ''دیکھیے میرا مشورہ ہے کہ آپ اپنے آپ پر بھروسہ رکھیں آپ متحد رہیں تو کسی کی ہمت نہیں ہو سکتی۔ بات ٹھیک تھی۔ اتحاد میں برکت ہوتی ہے لہٰذا اب بندر ماسٹر پرندوں کے اتحاد سے خائف ہو گیا تھا۔ الو اور چمگادڑ بھی اس کا ساتھ دینے کے لیے آمادہ نہ تھے۔
ان کا خیال تھا جہاں وہ رہتے ہیں وہ ہی جگہ ان کے لیے مناسب ہے۔ پہاڑوں کی دراڑوں اور غاروں میں جہاں درختوں کا گھنا سایہ بھی ہے۔ ماسٹر بندر تو بس اپنے لیے پیپل کے درخت کو قبضے میں لینا چاہتا تھا۔ جہاں اس کے پسندیدہ شہتوت بھی موجود تھے۔
معاملہ سب کو سمجھ میں آ گیا تھا کہ فساد دراصل کسی کے لیے اچھا نہیں ہوتا۔ کسی کے گھر پر قبضہ کرنے سے ہی فساد کا آغاز ہو جاتا ہے۔
سفید کبوتر بولا: ''بھائیو دوسروں کے گھروں پر قبضہ برے انسان کرتے ہیں۔ پرندوں کی فطرت میں یہ نہیں ایسی کوئی چیز اگر ہے تو وہ بھی شیطان کا بہکاوا ہے۔ مل جل کر رہنا اور ایک دوسرے کے کام آنا نیکی ہے۔ آپ لوگ امن اور بھائی چارے کے لیے ماسٹر بندر کو میٹھے اور رسیلے شہتوتوں کا ایک پیکٹ بنا کر تحفے میں بھیج دیں ان کا دل خوش ہو جائے گا۔ ساتھ ہی پیغام بھیج دیں کہ شہتوت اور پیپل کا سایہ سب کے لیے ہے۔ انھیں اس کے لیے کوئی سازش کرنے کی ضرورت نہیں......جنگل سب کا ہے اور سب چرند پرند اس کے باسی ہیں۔''
کبوتر کی تقریر ختم ہوئی تو سارے پرندوں کی خوشی بھری چہچہاہٹ سے جنگل گونج اٹھا۔ کبوتر کے حق میں خوب نعرے لگے۔
نعروں کی گونج میں سفید کبوتر نے ایک اُڑان بھری اور اپنے گھر کی طرف اڑ گیا۔

☆......☆
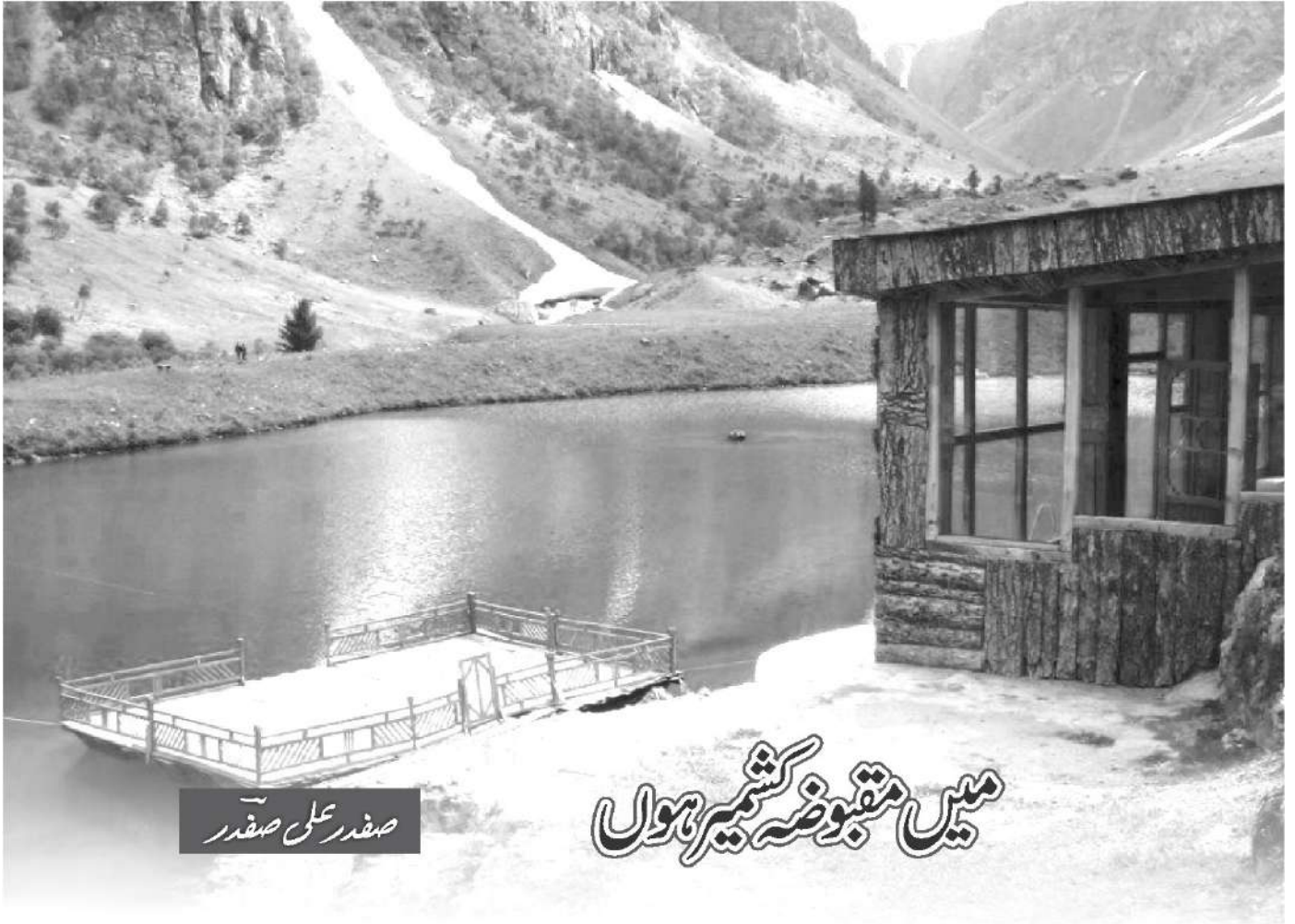
میں مقبوضہ کشمیر ہوں

صفدر علی صفدر

کشمیر ہوں کشمیر ہوں مَیں مقبوضہ کشمیر ہوں
مَیں رنگ و بُو کی وادی ہوں مَیں جنّت کی تصویر ہوں
جو خواب ہے اِک آزادی کا اُس خواب کی مَیں تعبیر ہوں
کشمیر ہوں کشمیر ہوں مَیں مقبوضہ کشمیر ہوں

سڑسٹھ سال سے مجھ پر ظالم مکّاروں کا قبضہ ہے
آزادی کی جنگ میں شامل میرا بچّہ بچّہ ہے
بھارت ظلم کی رات ہے اور مَیں اِمکاں کی تنویر ہوں
کشمیر ہوں کشمیر ہوں مَیں مقبوضہ کشمیر ہوں

ہندوستان کے بزدل فوجی میرا خون بہاتے ہیں
میرے بوڑھے بچّے جواں سب اپنی جان لٹاتے ہیں
بھارت کی خوش فہمی ہے کہ مَیں اُس کی جاگیر ہوں

کشمیر ہوں کشمیر ہوں مَیں مقبوضہ کشمیر ہوں

صفؔدر اک دن آزادی کا سورج دیکھنا نکلے گا
بزدل بھارت کا اندھیرا خود اُس کو ہی نگلے گا
اس کو لے ڈوبے گی جو مَیں اُس کی وہ تقصیر ہوں

کشمیر ہوں کشمیر ہوں مَیں مقبوضہ کشمیر ہوں

...... الفاظ کے معنی......

مکّار	:	دھوکے باز، فریبی، عیّار، مکر کرنے والا، دغاباز
امکان	:	اُمید، ممکن ہونا
تنویر	:	روشنی، اُجالا، چمک
خوش فہمی	:	گمان، جھوٹا خیال
جاگیر	:	وہ زمین جو بادشاہ یا حکومت کی طرف سے انعام میں دی جائے
تقصیر	:	غلطی، خطا، قصور

اور جواب مِل گیا!!

الطاف حسین

آزادی کی قیمت کا اندازہ صرف انسانوں کو ہی نہیں جانوروں کو بھی ہوتا ہے

''بابا جان! ہم کب تک ان خیموں میں پڑے رہیں گے؟ ہمیں اپنا گھر دوبارہ دیکھنا کب نصیب ہوگا؟'' تیرہ سالہ سرور کے چھوٹے سے ذہن سے آج اپنی عمر سے بڑے سوالات اُٹھ رہے تھے ''سرور بیٹا!'' جان علی چونکتے ہوئے بولا: ''ہم ایک نہ ایک دن ضرور اپنے گاؤں جائیں گے۔''

''وہ دن کب آئے گا؟'' سرور کا دِل آسانی سے مطمئن ہونے کو تیار نہ تھا۔

''ان شاء اللہ بہت جلد ہم آزاد فضاؤں میں چلے جائیں گے ہمیں اپنا گاؤں واپس مِل جائے گا۔'' جان علی نے سرور کے بے قرار دِل کو تسلی دینے کی کوشش کی۔

''بھارتی فوجی ہم پر ظلم کیوں کر رہے ہیں؟'' سرور کے ذہن میں ایک اور سوال اُٹھا۔

''اس لیے کہ ہم آزادی مانگتے ہیں۔'' جان علی نے جواب میں اصل وجہ بیان کردی۔

''بابا! آزادی کا مطلب؟'' سرور نے پوچھا۔

''یہ میں تمھیں کل بتاؤں گا اب تم سو جاؤ رات بہت ہو چکی ہے۔'' جان علی نے اسے تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

''کل مجھے اپنے سوال کا جواب مِل جائے گا؟'' سرور بولا۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں کل میں تمھیں عملی طور پر بتاؤں گا کہ آزادی کیا ہوتی ہے؟ شاباش اب سو جاؤ۔'' جان علی نے کہا اور کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

''بابا! اس کیمپ میں مجھے نیند نہیں آتی۔'' سرور یکا یک گھبرائے ہوئے انداز میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

''بیٹا! افسوس کہ میں کچھ کر نہیں سکتا اگر حالات تھوڑے سے بھی بہتر ہوتے تو میں تمھیں کندھے پر بٹھا کر اپنے گاؤں لے جاتا ہمارے گاؤں پر دشمن کا قبضہ ہے اور ان حالات میں ہم وہاں نہیں جاسکتے، بھارتی فوجی ہمیں دیکھتے ہی گولی مار دیں گے۔'' جان علی بھی اُٹھ کر سرور کے برابر بیٹھ گیا نہ جانے کیا سوچ کر اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

''بابا! آپ رو رہے ہو، کیا میری باتوں سے آپ کو دُکھ ہوا ہے؟'' سرور بے چین ہوتے ہوئے بولا: ''اگر ایسا ہے تو آئندہ میں کوئی ایسی بات نہیں کروں گا جس کی وجہ سے آپ کو دُکھ پہنچے بابا! مجھے معاف کردیں۔'' سرور نے جان علی کے سامنے اپنے ننھے ہاتھ جوڑ دیے۔

''ارے نہیں بیٹا تمھاری کسی بات سے مجھے دُکھ نہیں ہوا۔'' جان علی نے اس کے ہاتھوں کو تھام کر اپنے سینے سے لگا لیا۔

''اگر ایسی بات نہیں ہے تو پھر آپ رو کیوں رہے ہیں؟'' سرور آسانی سے مطمئن ہونے والا بچّہ نہیں تھا۔

''بیٹا! میرا دِل بھی اپنے گاؤں واپس جانے کو چاہتا ہے۔'' جان علی بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا اور سرور کی نگاہیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ خیمے کا ماحول خاصہ بوجھل ہو چلا تھا...اس کے بعد دونوں میں سے کسی نے کوئی بات نہ کی اور پھر دونوں خاموشی سے بستر پر لیٹ گئے۔ دونوں کے ذہن سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے اور سوچتے سوچتے نیند کی وادی میں جا پہنچے۔

اگلے دن جب سرور نیند سے بیدار ہوا تو اس کے بابا خیمے میں نہیں تھے۔

''بابا مجھے بتائے بغیر کہاں چلے گئے؟ اس سے پہلے تو اُنھوں نے ایسا کبھی نہیں کیا۔'' سرور خود کلامی کے انداز میں آنکھیں مَلتا ہوا بستر سے نیچے اُتر آیا۔ عین اسی لمحے خیمے کا پردہ اُٹھا اور جان علی ایک پوٹلی اُٹھائے

عورت

ایک عورت کی پڑوسن مرگئی۔ اس نے وہاں خوب بین ڈالے خوب ہی دل کھول کر روئی۔ گھر پہنچی تو دیکھا کہ اس کے بچے رو رہے ہیں۔ عورت نے ڈانٹ کر کہا: ''کم بختو چپ ہو جاؤ۔''

ایک بچہ بولا: ''خود تو دوسروں کے گھروں میں جا کر رو لیتی ہیں ہمیں اپنے گھر میں بھی نہیں رونے دیتیں۔''

مرسلہ: ملیحہ مدثر، حیدرآباد

اندر داخل ہوا۔

''بابا! آپ کہاں چلے گئے تھے؟ اور یہ پوٹلی میں کیا لائے ہیں؟'' سرور نے اپنے بابا کو سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تمھارے لیے ایک چیز لینے گیا تھا۔ لو تم خود اسے کھول کر دیکھ لو کہ اس کے اندر کیا ہے۔'' جان علی نے پوٹلی سرور کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ سرور نے جلدی سے پوٹلی کھولی تو اس کے اندر سے ایک لوہے کی تاروں سے بنا پنجرہ نکلا۔

''اس کے اندر تو دو کٹوریاں ہیں اور پرندہ؟'' سرور نے سوالیہ انداز میں جان علی کی طرف دیکھا۔

''پرندہ تم خود پکڑو گے۔'' جان علی نے دستر خوان بچھاتے ہوئے کہا ''آؤ پہلے ناشتہ کرلو۔''

سرور نے ہاتھ منہ دھو کر ناشتہ کیا اور پھر خالی پنجرہ اُٹھا کر خیمے سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد جان علی نے پہلے خیمے کی صفائی کی اور پھر دوپہر کا کھانا تیار کرنے کے بعد بستر پر لیٹ کر سرور کا انتظار کرنے لگا۔ اس دوران ظہر کی نماز کا وقت ہو گیا اور جان علی بستر سے اُٹھا اور وضو کرنے کے بعد خیمہ بستی کی مسجد میں چلا گیا۔

جان علی ظہر کی نماز پڑھ کر واپس خیمے میں آیا تو خیمہ اسی طرح بند تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ سرور ابھی تک لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ جان علی کو سخت بُھوک محسوس ہو رہی تھی لیکن وہ بیٹے کے بغیر کھانا کھانے کا عادی نہ تھا۔ اس نے سرور کی تلاش میں خیمہ بستی کا کونا کونا چھان مارا لیکن سرور کو نہ مِلنا تھا نہ مِلا وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا خیمہ بستی سے باہر نکل آیا۔ ابھی تو زیادہ دُور نہیں گیا تھا کہ اسے سرور ایک جھاڑی کی اوٹ سے نکلتا دِکھائی دیا۔

''بیٹا! میں نے تمھاری تلاش میں ساری بستی چھان ماری ہے اور تم یہاں پہنچے ہوئے ہو۔'' جان علی، سرور کے قریب جا کر بولا۔

''بابا! میں پرندہ پکڑنے آیا تھا۔'' سرور نے معصومیت سے کہا ''آپ نے خود ہی تو کہا تھا پرندہ مجھے خود پکڑنا ہوگا۔''

''ہاں ہاں کہا تو تھا۔'' جان علی کو اپنی بات یاد آگئی ''کیا

تم نے پرندہ پکڑا بھی ہے؟''

''میں نے پرندہ پکڑلیا ہے!!'' سرور نے خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے پنجرہ اپنے بابا کی آنکھوں کے سامنے کردیا جس میں اب ایک چڑیا قید ہوچکی تھی۔

''چلو اب گھر چلتے ہیں۔'' جان علی خیمہ کو گھر ہی کہا کرتا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اپنے خیمے میں داخل ہورہے تھے۔

''بابا! پہلے ہم چڑیا کو کھانا کھلائیں گے اور اس کے بعد خود کھائیں گے۔'' سرور نے پنجرہ بستر پر رکھتے ہوئے کہا۔

''جیسے تمھاری مرضی۔'' جان علی بولا۔

سرور نے نہایت محتاط انداز میں پنجرے کا چھوٹا سا دروازہ کھول کر دونوں کٹوریاں باہر نکالیں اور پھر ایک کٹوری میں پانی اور دوسری کٹوری میں روٹی کے باریک باریک ٹکڑے بناکر رکھے اور پھر دونوں کٹوریاں باری باری پنجرے کے اندر رکھ کر دروازہ بند کردیا۔ سرور سوچ رہا تھا کہ چڑیا فوراً روٹی کے ٹکڑے چگنا شروع ہوجائے گی لیکن ایسا ہوا نہیں چڑیا نے نہ روٹی کے ٹکڑے کھائے اور نہ ہی پانی کو منہ لگایا اور ایک طرف گم سم بیٹھی رہی۔

''بابا! چڑیا کھانا کیوں نہیں کھارہی ؟'' سرور کے چہرے پر پریشانی کی جھلک نمایاں تھی۔

''اس سوال کا جواب بھی تم ہی دو گے۔'' جان علی نے مُسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

''مجھے نہیں معلوم۔'' سرور نے نفی میں سر ہلایا۔

''ایسا کرو تم اس کے سامنے سے ہٹ جاؤ...شاید چڑیا کو بُھوک نہیں ہے آؤ ہم کھانا کھالیتے ہیں۔'' جان علی نے دسترخوان بچھاتے ہوئے کہا۔

''اچھا!'' سرور کچھ سوچتے ہوئے پنجرے کے قریب سے اُٹھ کر دسترخوان کے سامنے بیٹھ گیا۔ کھانا کھانے کے دوران سرور بار بار چڑیا کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن وہ جہاں تھی اب بھی وہیں بیٹھی ہوئی تھی۔

''بہت اُداس لگ رہی ہے بے چاری!!'' سرور نے جگ سے گلاس میں پانی اُنڈیلتے ہوئے کہا۔

''اپنوں سے جُدا ہونے کے بعد کون خُوش ہوتا ہے۔'' جان علی نے لقمہ توڑتے ہوئے کہا۔

کھانا کھانے کے بعد جان علی تو آرام کرنے کے لیے

خوش اخلاقی

ایک دفتر میں ہفتہ خوش اخلاقی منایا جارہا تھا۔ اس دوران ایک کلرک کو سوتے ہوئے دیکھ کر دوسرے کلرک نے اسے آہستہ سے جگایا اور انتہائی نرمی سے کہا: ''معاف کرنا بھائی میں تمھیں ہرگز نہ جگاتا اگر معاملہ اتنا اہم نہ ہوتا۔ بات دراصل یہ ہے کہ تم نوکری سے فارغ کردیے گئے ہو۔''

مرسلہ: کومل فاطمہ اللہ بخش، کراچی

بستر پر لیٹ گیا اور سرور لکڑی کے صندوق کے پیچھے بیٹھ گیا اور وہاں سے چُھپ کر چڑیا کو دیکھنے لگا۔ دوپہر سے سہ پہر اور سہ پہر سے شام ہوگئی لیکن چڑیا نے کچھ نہ کھایا۔ اس صُورت حال نے سرور کو سخت پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔

''بابا! بابا! اُٹھیں۔'' اچانک اس نے جھنجھوڑتے ہوئے اپنے بابا کو اُٹھا دیا۔

''کیا ہوا؟'' جان علی نے آنکھیں مَلتے ہوئے پوچھا۔

''بابا!... چڑیا نے ابھی تک کچھ نہیں کھایا۔'' سرور کے لہجے میں دُکھ کی جھلک تھی۔

''اچھا!'' جان علی نے معنی خیز انداز میں سرور کو دیکھتے ہوئے بولا ''کھائے گی بھی کیسے؟''

''بابا! میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا۔'' سرور نے اُلجھے ہوئے انداز میں کہا۔

''تم اسے اس بھی اچھی چیز دو گے تو یہ نہیں کھائے گی؟'' جان علی بولا۔

''کیوں نہیں کھائے گی؟'' سرور نے بے قراری سے پوچھا۔

''اس لیے کہ تم نے اسے قید کر رکھا ہے اس کی آزادی چھین لی ہے اور جو آزادی پسند ہو تم اس کے سامنے سونے کے نوالے بھی رکھ دو... تو وہ خوش نہیں ہوگا تمھاری غلامی قبول نہیں کرے گا کیونکہ اسے صرف آزادی سے محبت ہے آزاد رہ کر بھوک بھی برداشت کرے گا پیاس کی شدّت بھی لیکن غلامی ہرگز برداشت نہیں کرے گا۔''

''اگر میں کل تک بھی اسے پنجرے میں قید رکھوں تو بھی یہ چڑیا کچھ نہیں کھائے گی؟'' سرور نے استفساریہ انداز میں اپنے بابا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں یہ بھوکی مر جائے گی لیکن غلامی کی چیز نہیں کھائے گی تم چاہو تو آزما کر دیکھ سکتے ہو۔'' جان علی نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''نہیں بابا! میں ایسی آزمائش نہیں کرسکتا جس میں کسی کی جان چلی جائے۔'' سرور اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔

''تو پھر ایسا کرو کہ اسے آزاد کر دو۔'' جان علی نے تجویز پیش کی اور سرور نے فوراً پنجرہ اُٹھایا اور جلدی سے خیمے سے باہر نکل آیا۔ جان علی بھی اس کے ساتھ باہر آگیا۔

سرور نے آہستہ سے پنجرے کا دروازہ کھولا اور چڑیا ''پُھر ررر'' کی آواز کے ساتھ پنجرے سے باہر نکل گئی۔ آزادی ملنے پر وہ بہت خُوش دِکھائی دے رہی تھی!!! چڑیا ایک درخت سے دوسرے درخت کی طرف اُڑتی پھر رہی تھی اور فضا میں پرواز کرتی چڑیا کو دیکھ کر سرور کو اپنے سوال کا جواب مِل گیا تھا۔

☆......☆

"چلو بھئی حسان! تمہارا مسئلہ تو حل ہوا۔" امی نے فون رکھتے ہوئے کہا اور کچن کی طرف بڑھیں۔

"میرا کون سا مسئلہ؟" میں نے فضہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے کندھے اُچکائے اور کچن میں امی کے پیچھے چل پڑی۔ اس کے واپس آنے تک میں یہی سوچتا رہا کہ میرا کون سا ایسا مسئلہ تھا جس کے حل ہونے پر امی اس قدر خوشی سے مجھے بتا کر گئی ہیں۔

"پھپھو کا فون تھا...... عادل بھائی کی شادی ہے۔" فضہ نے واپس آ کر بتایا۔

"یہ تو عادل بھائی کا مسئلہ حل ہو رہا ہے نہ کہ میرا......" میں نے فضہ سے کہا۔

"ایک تو تم......" فضہ کچھ بول ہی رہی تھی کہ امی کمرے میں داخل ہوئیں۔

"تم ہی تو رٹ لگائے ہوئے تھے کہ تمھاری چھٹیاں ہیں کہیں چلیں۔ اب دیکھو اللہ نے کیسا انتظام کر دیا۔"

"تو کیا آپ سب بھائی جان کو چھوڑ چھاڑ کر پھوپھو
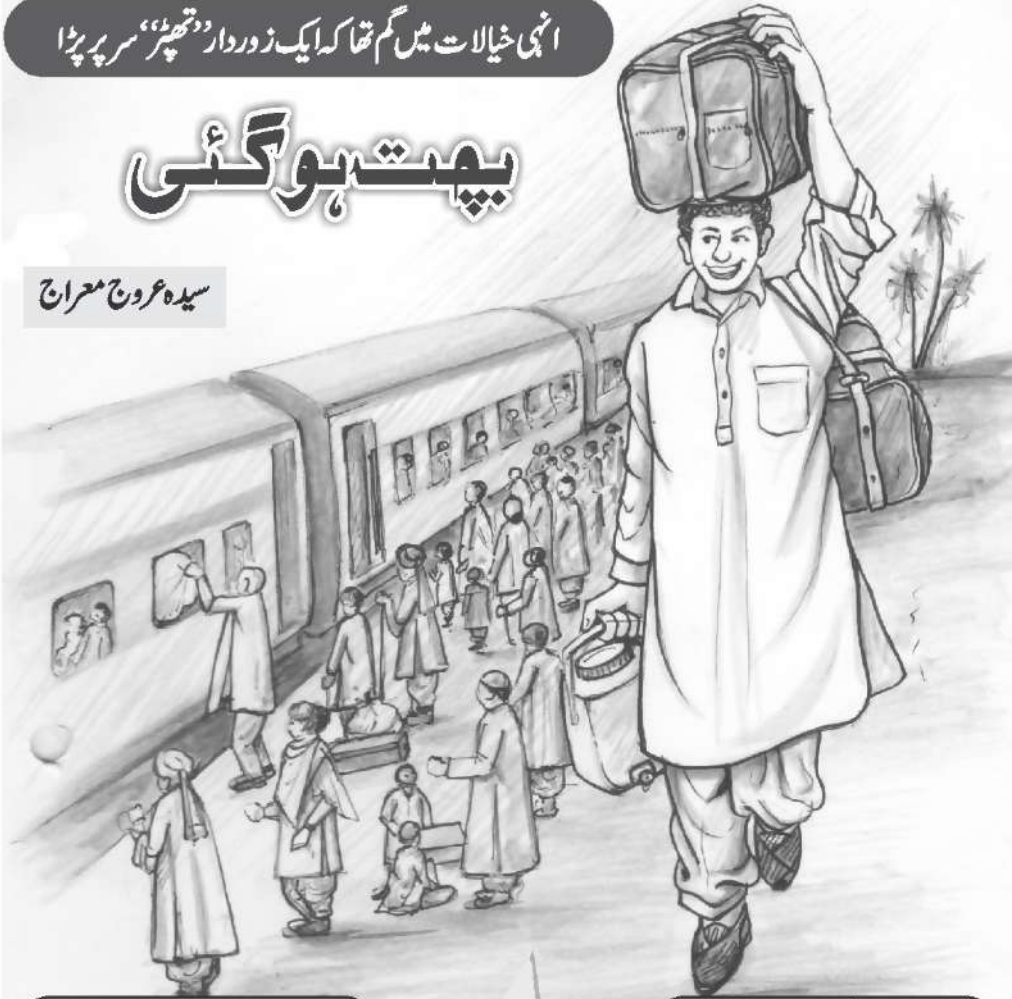
کے پاس چلے جائیں گے۔"
"نہیں میں نے آپا کو بتا دیا تھا کہ حماد کا داخلہ ٹیسٹ ہونے والا ہے اس لیے ہمارا آنا مشکل ہے تو بُرا مان گئیں کہ ٹیسٹ حماد کا ہے تم سب گھر بیٹھ کر کیا کرو گے۔ اس لیے میں سوچ رہی ہوں کہ تم چلے جاؤ کیونکہ فی الحال تم فارغ ہو۔"
"میں؟" میں نے منہ بنایا۔
پھوپھو کے گھر جب میں آخری دفعہ گیا تھا تو میری عمر سات سال تھی اور وہاں جانا میری زندگی کے ناخوشگوار تجربے کے طور پر آج تک میرے ذہن میں محفوظ تھا۔
"مگر میں وہاں نہیں جانا چاہتا۔" میں نے امی سے کہا مگر امی وہاں سے جا چکی تھیں۔
"کیوں؟" فضہ نے پوچھا۔
"کیونکہ پھوپھا جان بہت مغرور ہیں۔"
"تو؟"
"اور وہ بہت غصیلے ہیں۔"
"پھر؟"
"وہ بہت کنجوس ہیں۔"
"اور؟......اور وہ بدمزاج بھی ہیں۔" فضہ بولی۔
مگر تمھیں تو وہاں شادی میں شرکت کرنے جانا ہے نہ کہ پھوپھا جان سے ملنے۔ شادی میں شرکت کرنا، رشتہ داروں سے ملنا، مزے کرنا اور واپس آجانا۔"
"بلکہ مزے تو تمھیں پھوپھا جان کروا ہی دیں گے۔" فضہ شرارت سے مسکرائی۔
"ہاں پچھلی دفعہ کی طرح۔" میں نے زیرِ لب کہا۔
اگلی صبح میں گھر سے اسٹیشن کی طرف رواں دواں تھا۔
"یاد ہے ناں، راستے میں کسی سے کوئی چیز لے کر نہیں کھانی، نہ ہی اجنبی مسافر سے زیادہ بات چیت کرنی ہے۔ ابو نے ۱۰۰ ویں مرتبہ یاددہانی کروائی۔
"جی جی ابو، میں نے بھی ۱۰۰ ویں مرتبہ اثبات میں سر ہلایا۔
"اور وہاں پہنچ کر فون کرنا مت بھولنا۔" امی نے بھی اپنا فرض نبھانا ضروری سمجھا۔
"امی میں آپ کو ہر اسٹیشن پر کال کروں گا۔ میرے پاس پیکج ہے فری کالز کا۔" میں نے اپنے دانتوں کی نمائش کی۔
"بس پریشان مت ہونا، راستے میں دعائیں پڑھتے ہوئے جانا۔" امی فکرمندی سے بولیں۔
"امی! حسان محاذ پر نہیں جا رہا۔" فضہ نے کہنا ضروری سمجھا۔
"فرمانبردار بچوں کی ماں باپ ایسے ہی فکر کرتے ہیں آپ کیوں جل رہی ہیں؟"
ٹرین میں بیٹھ کر ان لوگوں کو ہاتھ ہلایا تو دیکھا کہ امی نا جانے کون سا دَم کرنے میں مصروف تھیں۔ شاید امی مجھے واقعی 'محاذ' پر بھیج رہی ہیں مجھے پھوپھا جان کا خیال

آیا۔

☆......☆

ثاقب اپنے کسی بڑی عمر کے کزن کے ساتھ اسٹیشن پر موجود تھا۔ ہم تینوں پھوپھو جان کے گھر پہنچ کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ سامنے ہی کوئی رعب داب والی شخصیت بیٹھ ہوئی تھی۔ گو وہ بہت بدل گئے تھے مگر پھر بھی میں نے اُنھیں پہچان لیا۔

''السلام علیکم پھوپھا جان'' میرے منھ سے مری ہوئی آواز میں نکلا۔ پھوپھا جان نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔

''ابو! احسان آیا ہے۔'' ثاقب بولا۔

''اچھا۔'' پھوپھا جان اخبار سے نظریں اٹھائے بغیر بولے۔

''وہ آپ کو سلام کر رہا ہے۔'' ثاقب منمنایا۔

''اچھا۔'' پھوپھا جان پھر اسی اسٹائل میں بولے۔

مجھے بے عزتی کا احساس ہوا اور میں زور سے بولا۔

''پھوپھا جان'' پھوپھا جان نے پہلی بار نظر اٹھا کر مجھے دیکھا پھر دوبارہ اخبار پر نظریں جمادیں۔

''برخوردار! میں بہرا نہیں ہوں۔''

''جی۔''

''اور نہ ہی اونچا سنتا ہوں۔''

''جی...... میں...... وہ۔'' میں کچھ بولنا چاہ رہا تھا کہ پھوپھو جان پتا نہیں کہاں سے نمودار ہوئیں۔

''ارے میرا بچہ آ گیا۔'' وہ میری بلائیں لیتے ہوئے

کتابیں

چھوٹی بچی وکیل صاحب کے گھر گئی۔ وہاں ڈھیروں کتابیں دیکھ کر وکیل صاحب سے کہا:

''چچا جان! کیا آپ بھی ابو کی طرح لائبریری سے کتابیں لے کر واپس نہیں کرتے؟''

مرسلہ: میثم عباس، کراچی

بولیں۔ ''سفر تو ٹھیک سے گزرا ناں؟ کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟ امی کو بتا دیا کہ پہنچ گئے ہو؟''

پھوپھو جان نے سوالوں سے تابڑ توڑ استقبال کیا مگر پھوپھا جان کے والہانہ استقبال کی وجہ سے میں ویسے ہی بجھ چکا تھا۔

ہوسکتا ہے کہ وہ چھوٹوں سے بات نہ کرتے ہوں۔ میں نے اپنے آپ کو تسلی دی مگر اگلے دن ناشتے کی میز پر میری یہ غلط فہمی دور ہوگئی جب انھوں نے مجھ سے سوالات کر کے نیا ریکارڈ بنایا۔

''کیوں میاں کچھ پڑھتے وڑھتے بھی ہو؟''

''اور تمھارا بھائی کیا کر رہا ہے؟ دسویں میں تو اس کے نمبر ہمارے عادل سے کافی زیادہ آئے تھے۔ ہاں اس نے امتحان بھی تو عادل کے بہت سال بعد دیا تھا۔ اصل میں مَیں تو کہتا ہی یہی ہوں کہ تھوڑی بڑی عمر میں امتحان دو تو ذرا اچھے نمبر بھی آئیں۔ مگر تمھاری پھوپھو

کو سمجھ میں نہیں آتا۔ بھلا بتاؤ کچھ مہینوں کا ہی فرق ہوگا دونوں میں......''

''ہاں چالیس، پچاس مہینوں کا......'' میں نے منہ کھولا ہی تھا کہ اگلا سوال آیا۔''اور بابا کا کام کیسا چل رہا ہے؟''

ناشتہ ان کے حصے میں اور سوالات میرے حصے میں آرہے تھے۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ کہہ دوں لکھ کر دے دوں گا اپنی سوانح حیات، ناشتہ تو کرنے دیں۔ آخر جب سوالات سے اچھی طرح پیٹ بھر گیا تو میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ ثاقب نے روکا بھی مگر اب مزید سوالوں کی ہمت نہیں تھی میرے اندر۔

''بھئی بے چارہ سفر سے آیا ہے اور سفر میں ہاضمہ ویسے بھی خراب ہونے کا خطرہ ہوتا ہے اس لیے تم لوگ زبردستی نہ کرو اس کے ساتھ۔'' پھوپھا نے جلدی سے کہا۔

''لو بھئی! اب مجھے اس اصرار سے بھی محروم کر دیا جو مہمانوں سے کھانے کے لیے کیا جاتا ہے۔'' میں نے دل میں سوچا۔

☆......☆

اگلے دن شام کی چائے پر پھوپھا جان کا موڈ بہت اچھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولے۔''آؤ بھئی آؤ۔ کیا نام ہے تمہارا حسن۔''

''جی حسان۔'' میں نے کہا۔

''ہاں حسان! میں کل یہی ثاقب کو بتا رہا تھا تم دونوں دُولھا کے بھائی ہو، اسی لیے ساری شادی تم لوگوں نے ہی نمٹانی ہے۔'' میں حیرت سے پھوپھا کو دیکھ رہا تھا۔

''ہاں تو آج ہی ڈیوٹی پر لگ جاؤ تم لوگ۔'' میں نے زیر لب دھرایا۔

''ڈیوٹی؟'' مگر اگلے ہی دن ڈیوٹی کا صحیح مفہوم سمجھ آ گیا جب صبح ہی صبح ثاقب نے مجھے اٹھا دیا کہ اس کے ساتھ انتظامات کرواؤں۔

پورا دن مہمانوں کو بٹھانے اور کھانا کھلانے کا انتظام کرتے گزر گیا۔ زیادہ تر مہمان کیونکہ دوسرے شہر سے آئے تھے اس لیے وہ آرام سے بیٹھے خدمت لے رہے تھے اور میں شاید اگلی گلی سے اٹھ کر آ گیا تھا۔

☆......☆

''ارے حسان! میرے بچے ذرا جلدی سے بھاگ کر جاؤ، بازار سے روٹیاں تو لے آؤ۔'' پھوپھو مجھے آواز دیتے ہوئے کہتیں۔

''حسان ذرا ثاقب کے ساتھ جا کر سامان لے آؤ۔''

''حسان! درزی سے کپڑے لے آئے؟'' آواز آتی۔

''حسان بھائی! امی کہہ رہی ہیں کہ جب عصر کی نماز پڑھنے جائیں تو جلیبی سموسے لے آیئے گا۔'' میری چھوٹی کزن مجھے پیسے پکڑاتی ہوئی کہتیں۔

مجھے لگتا کہ میرا ابلاوا صرف کام کروانے کے لیے دیا گیا

تھا۔

☆......☆

اگلے دن ولیمہ تھا تو سوچا تھا کہ صبح دیر تک سوتا رہوں گا۔ مگر صبح ایک بار پھر ثاقب صاحب موت کے فرشتے کی طرح سر پر کھڑے تھے۔

''آج تو جلدی اٹھ جائیں، آج شادی ہے۔''

''یہ عادل بھائی کیا کرتے رہتے ہیں۔ ان کے ساتھ کرواؤ ناں...... کام۔'' میں نے ثاقب کو مشورہ دیا۔

''ارے بھئی وہ کیوں کام کریں گے؟ ان کی تو شادی ہے۔''

''تو؟ وہ مایوں بیٹھے ہیں جو کوئی کام نہیں کرواسکتے؟''

''مجھے نہیں پتا لیکن ابو نے ان کو کوئی بھی کام کرنے سے منع کیا ہے۔''

''لو بھئی۔'' میں اٹھ بیٹھا۔

''حسان! تمھاری امی کا فون آیا ہے۔'' کسی نے آ کر مجھے بتایا۔

''امی! میں واپس آنا چاہتا ہوں۔'' میں نے چھوٹتے ہی کہا۔

''ایسا کیا ہوگیا کہ تم شادی سے پہلے واپس آرہے ہو؟'' امی نے پوچھا۔

''سب مجھ سے اتنے کام کروار ہے ہیں لگتا ہے مجھے صرف کام کروانے کے لیے بطور خاص بلایا ہے۔'' میں نے شکایت کی۔

''ارے بیٹا ایسے نہیں کہتے۔'' اپنے ہی تو کام آتے ہیں اور صحیح بات تو یہ ہے کہ ایسے موقعوں پر کام کروانے ہی میں مزہ آتا ہے۔ مجھے سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم اتنے بور کیوں ہو رہے ہو۔''

''اپنی مرضی سے کام کروں تو مزہ آئے ناں۔''

''بیٹا جو کام وہ لوگ تم سے کہہ رہے ہیں اسی میں مزہ تلاش کرو۔ یقین کرو بہت مزہ آئے گا۔''

فون رکھ کر میں یہی سوچ رہا تھا کہ مزہ کیسے تلاش کروں کہ ثاقب آدھمکا۔

''آپ کو ابو بلا رہے ہیں۔'' میں اس کے پیچھے چل پڑا پھوپھا جان تیار ہو کے بیٹھے تھے اور جلدی جلدی موزے پہن رہے تھے۔

''تمھارے پھوپھا جان کو بزنس میٹنگ کے لیے ایمرجنسی میں جانا پڑ رہا ہے اب شام کو ہی ان کی واپسی ہوگی۔'' پھوپھو نے مجھے بتایا۔

''ہاں حسان! ویسے تو میں نے سارے کام کر لیے ہیں مگر ابھی مجھے ایک بار پھر سب کنفرم کرنے دو تین جگہ جانا تھا کہ یہ ضروری کام آپڑا۔ تم ثاقب کو لے کر چلے جاؤ ذرا وہ کام کرنے۔''

''سم چینج کر دی تم نے؟'' پھوپھا نے پھوپھو سے پوچھا۔

''سم کیوں چینج کر رہے ہیں؟'' میں نے سرگوشی میں ثاقب سے پوچھا۔

آگ

شاعر (بیوی سے) ''میں اپنی شاعری سے دنیا بھر میں آگ لگا سکتا ہوں۔''
بیوی: ''تو ایک شعر چولھے میں بھی ڈال دیجیے تاکہ آگ جل جائے۔''

مرسلہ: صدف شمیم، کراچی

''کیونکہ چین میں یہ سم نہیں چلے گی۔''
''کیا؟ پھوپھا جان آج کے دن چین جا رہے ہیں؟''
مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔
''بھئی بہت اہم کام ہے جو ابو بہت سال سے کرنا چاہ رہے تھے۔'' ثاقب نے مجھے بتایا جو کہ سم نکال کر مجھے پکڑا چکا تھا۔
''اس سے کہنا کہ کھانا ٹھیک نو بجے تک تیار چاہیے۔''
پھوپھا نے مجھے رسیدیں تھماتے ہوئے کہا۔
''اور مرچیں......'' پھوپھو نمودار ہوئیں۔
''مرچوں کا کہہ دیا تھا آپ نے کہ کم رکھنی ہیں۔ پچھلی دفعہ اس نے بہت کر دی تھیں۔'' پھوپھو نے بات مکمل کی۔
''اوہ ہاں ثاقب جا رہا ہے ناں کہہ دے گا۔ اس سے کہنا کہ مرچیں پچھلی دفعہ سے کچھ کم رکھے۔'' پھوپھا نے بتایا۔

''ہنہ ان کو مہمانوں کو کھانا کھلانا ہے یا پھر مریضوں کے لیے۔ میں نے دل میں سوچا۔ ہنہ! کھانا پھیکا کروا دو اس کام میں کیا مزہ تلاش کیا جا سکتا ہے؟ راستے میں مَیں یہ سوچتا ہوا جا رہا تھا۔
''ارے۔'' مجھے خیال آیا۔ مزہ تو آ سکتا ہے اس میں بھی۔''
''اشتیاق صاحب نے کہا ہے کہ مرچیں پچھلی دفعہ سے زیادہ رکھنی ہیں۔ پچھلی دفعہ کھانا بہت پھیکا بھیجا تھا آپ نے۔'' میں ہوٹل منیجر کے سامنے بیٹھا تھا۔
''پھیکا تھا پچھلی دفعہ؟'' منیجر حیرانی سے بولا۔
''بالکل ...... اور ہاں میٹھے میں کھیر کی جگہ قلفی فالودہ کر لیں......''
''ہاں پیسے جو اوپر نیچے ہوں گے وہ اشتیاق صاحب کر لیں گے پہلے کبھی مسئلہ ہوا ہے پیسوں کا؟''
اتنے میں ثاقب صاحب اوپر آتے ہوئے نظر آئے۔ وہ نیچے پھوپھا کے لیے سگریٹ ڈھونڈ رہا تھا۔
''چلتا ہوں۔'' میں پلٹا تو ثاقب بھی واپس مڑ گیا۔
ہماری اگلی منزل شادی ہال تھا جہاں ہمیں صفائی کے انتظامات دیکھنے تھے۔ جلد ہی ہم لائن سے بنے ہالز کے سامنے کھڑے تھے۔ میرے ساتھ ثاقب بھی اترنے لگا تو میں نے کہا۔
''ثاقب! یہ علاقہ چھینا جھپٹی کے حوالے سے بہت مشہور ہے۔ تم جلدی سے اپنی موٹر سائیکل لے کر

قریبی گلی میں گھس جاؤ۔ جلدی کرو۔ تمھیں پتا ہے چھن گئی تو پھوپھا نئی بھی نہیں دلائیں گے۔''

''آپ کو کیسے پتا اس علاقے کا؟'' ثاقب حواس باختہ ہوگیا۔

''مجھے سب پتا ہے اس علاقے کا بھی اور تمھارے ابا کا بھی جلدی جاؤ۔''

ثاقب سر ہلاتا ہوا موٹر سائیکل قریبی گلی میں بھگا کر لے گیا اور میں اعتماد سے چلتا ہوا ہال میں داخل ہوا۔ رسیدیں میری جیب میں تھیں۔

''آج رات ہونے والی تقریب کے حوالے سے آیا ہوں۔'' میں نے رسیدیں سامنے نکالتے ہوئے کہا۔

جی......جی......تشریف رکھیے۔

''اصل میں آج خاندان میں کسی کا انتقال ہوگیا ہے۔ اشتیاق صاحب نے کہا ہے کہ سو کرسیاں کم کردیں۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

اسی طرح دو تین جگہ حکم دیتا ہوا میں واپس پلٹا۔ کسی کا کوئی ڈر نہیں تھا۔ پھوپھا کو عین وقت پر آنا تھا اور ویسے بھی ان کی سم اس وقت میری جیب میں تھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ مجھے کون سا یہاں ٹھہرنا تھا۔ سوچا تھا کہ سب کچھ کروا کے واپس چلا جاؤں گا اور گھر والوں کو بتانے کے لیے کوئی بہانہ راستے میں سوچ لوں گا۔

☆......☆

ہم گھر واپس پہنچے تو مغرب کی اذان میں کچھ دیر باقی تھی۔ اپنا سامان جلدی جلدی پیک کیا اور سب کی نظریں بچا کر باہر نکلا ویسے بھی اس ہنگامے میں کسی کو میری یاد کیوں آتی! سارے کام تو میں کروا چکا تھا۔

ابھی اسٹیشن پر پہنچا ہی تھا کہ ایک ٹکٹ خرید لوں۔ دل میں بار بار خیال بھی آ رہا تھا کہ ایسی تقریب جس میں اتنا 'مزہ' آنا ہے چھوڑنی نہیں چاہیے۔ انھی خیالات میں گم تھا کہ ایک زوردار ''تھپڑ'' سر پر پڑا۔

''تمھیں کس نے بتایا کہ ہم لوگ آ رہے ہیں؟'' بھائی جان کی آواز آئی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو دور امی، ابو اور فضہ بھی نظر آ گئے۔

''لو بھئی!!''

''حسان نے آج ٹیسٹ دے دیا ہے اس لیے ہم سب آ گئے۔'' امی نے بتایا۔

گاڑی پھوپھو کے گھر کی طرف رواں دواں تھی اور میں دعا کر رہا تھا کہ آج بچت ہوجائے۔

''ارے تم کہاں تھے؟'' ابھی ہوٹل والے کا آدمی آیا تھا کہہ رہا تھا کہ تم نے مرچیں بڑھانے کا کہا ہے۔''

پھوپھو نے مجھ سے پوچھا۔

''میں نے؟'' میں نے تھوک نگلا۔

''میں نے تو بتا دیا کہ ارے اس نے کہا تھا کہ مرچیں پچھلی دفعہ زیادہ تھیں، اس بار کم کریں۔''

''اُلٹا سمجھ میں آیا اس کو۔'' پھوپھو ہنستے ہوئے بولیں۔

''یااللہ خیر باقی سب بھی اپنے آدمی بھیجنا نہ شروع کر دیں۔'' میں نے دل سے دعا مانگی۔

''یااللہ پھوپھا کو فلائٹ نہ ملے، وہ آج نہ پہنچ سکیں۔'' میری حالت پتلی ہو رہی تھی۔

''ابو آپ کو بلا رہے ہیں۔'' ثاقب نے رٹا رٹایا جملہ پھر دہرایا۔

''کیا؟ ابو کب آئے تمھارے؟'' میں نے دل میں سوچا۔

''آؤ بھئی آؤ ثاقب اپنے بھائی کو یہاں بٹھاؤ۔ مجھے سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ مذاق کر رہے تھے یا طنزیا پھر سنجیدہ تھے۔

''یااللہ! مجھے بچالے۔'' میرے دل سے دعا نکلی۔

''ہاں بھئی کیا نام ہے تمہارا احسن! مجھے تمہارا شکریہ ادا کرنا تھا۔'' پھوپھا جان نے کہا۔

''یہ تو میرا فرض تھا۔'' کہتے ہوئے حقیقتاً میری آنکھیں نم ہو گئیں اپنا متوقع انجام سوچ کر۔

''چلو جا کر تم لوگ تیار ہو جاؤ دلھن والوں نے نو بجے کا کہا ہے۔'' پھوپھا جان اٹھتے ہوئے بولے۔

''ارے ہاں میری سم کس کے پاس ہے؟'' پھوپھا نے پوچھا تو میں نے سعادت مندی کے تمام ریکارڈ توڑتے ہوئے ان کے موبائل میں سم ڈالی۔ ابھی موبائل کھلا ہی تھا کہ بیل بجنے لگی۔

یقیناً میرے کسی کارنامے کی تصدیق کے لیے آ رہا ہوگا۔''

''یااللہ! اس بار بچالے آئندہ ایسی حرکت کسی کے ساتھ نہیں کروں گا بے شک وہ پھوپھا جان جیسا ہی کیوں نہ ہو۔'' میرے روئیں روئیں سے فریاد نکل رہی تھی۔

''کیا؟''

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟''

''وہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ ولیمہ کینسل کر دیں۔'' پھوپھا نے بم پھوڑا۔

''کیوں بھئی۔'' پھوپھو نے گھبرا کر پوچھا۔

''دلھن کے نانا کو دل کا دورہ پڑا ہے۔ وہ لوگ ہسپتال بھاگے ہیں۔''

''استغفراللہ۔''

''اب کیا کریں۔''

''میں نے کہہ دیا ہے کہ نو دس بجے تک انتظار کر لیتے ہیں ورنہ پھر ولیمہ دو چار روز بعد رکھ لیں گے۔ اچھا تھوڑی لگے گا اور خدانخواستہ نانا صاحب کو کچھ ہو گیا تو ہماری تقریب خراب ہو جائے گی۔'' پھوپھا نے بات سمیٹی۔

''اللہ صحت دے اُنھیں۔'' پھوپھو نے کہا۔

''آمین۔'' میں نے سکون کا گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

☆......☆

آہ بچارے!

طوبیٰ بنت فاروق

کتا ایک وفادار جانور ہے۔ یہ تو ہم نے بہت دفعہ سنا ہے لیکن ہمارے مطابق تو کتا صرف ایک خطرناک جانور ہے۔ یہ جانور اگر کہیں نظر آ جائے تو اِسے دیکھتے ہی ڈر کے مارے رفو چکر ہونے کا خیال دل میں آتا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس سے ڈر کر فوراً بھاگ بھی نہیں سکتے۔ وجہ یہ کہ ہمیں بھاگتا دیکھ کر کتے شک میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ یا تو ہم ان کا کچھ چرا کر بھاگ رہے ہیں (ویسے سوچنے کی بات ہے کتوں کے پاس سے ہمیں چرانے کی کیا چیز ملے گی۔ لیکن اب ان کو کون سمجھائے) بجائے اس کے کہ کسی بندے کو ڈر کر بھاگتا دیکھ کر اس کی بزدلی پر بیٹھ کر ہنسیں الٹا اس کے پیچھے بھاگ کر اسے سزا دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ شاید وہ اسے اپنی توہین سمجھتے ہیں کہ انہیں کوئی نظرانداز کرے۔

کل ہی کی بات ہے ایک آنٹی اپنے بیٹے کا ذکر کرتے ہوئے کہنے لگیں کہ ابھی تو اسے ٹیکے لگوانے پڑے ہیں۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ بیچارہ گلی سے گزر رہا تھا۔ راستے میں ایک کتا سویا ہوا تھا۔ اب بچے نے تو چپ چاپ گزرنا چاہا مگر نا جانے کیسے اس کی آنکھ کھل گئی اور پڑ گیا بچے کے پیچھے۔

اب ذرا سلیم صاحب کی سنیے وہ ہمارے محلے میں رہتے ہیں۔ ایک دفعہ بتانے لگے کہ وہ گوشت لے کر آ رہے تھے کہ راستے میں وہی دو موصوف نظر آئے۔ اب تو سلیم صاحب کے دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں بلکہ گھنٹے بجنے لگے۔ ایک تو وہ ہیں بھی بلا کے کنجوس پتا نہیں کس دل سے گوشت لا رہے ہوں گے لیکن کتوں کو کیا پتا۔ وہ سمجھے شاید ہماری دعوت کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ وہ لپکے سلیم صاحب

کے پیچھے جیسے کہہ رہے ہوں کہ ہم تو کچا کھا لیتے ہیں پکانے کی زحمت نہ کریں لیکن وہ سلیم صاحب ہی کیا جو ایسے جانوروں کے جھانسے میں آجائیں وہ تو کبھی انسانوں کے جھانسے میں بھی نہ آئے۔ انھیں قریب کھڑا محلے کا بچہ نظر آیا۔ اشارے سے بلایا۔ ہاتھ پیچھے کر کے گوشت کی تھیلی پکڑائی اور اسی وقت دوسرے ہاتھ میں موجود خالی تھیلی کتوں کی طرف پھینکی۔ جیسے ہی وہ اس تھیلی کی طرف لپکے سلیم صاحب بچے کے پیچھے یہ جا وہ جا۔ یہ داستان سن کر ہم پوچھ ہی بیٹھے۔ اچھا اسی وجہ سے آپ دو تین دن سے باہر نظر نہیں آرہے انھوں نے بھی سچی سچی بتا دیا کہ ''ہاں بھئی کیا پتا وہ کتے ہمارے انتظار میں ہوں۔ اب احتیاط کرنی پڑتی ہے۔''

اب اسی حوالے سے ایک کہانی سنیں جو ہماری امی کو ان کی پھوپھو سنایا کرتی تھیں اور ہمیں ہماری امی ان کے مطابق پہلے کتے جنگل میں اور بھیڑیے شہر میں ہوا کرتے تھے اور کتوں کے مقابلے میں کم اُودھم مچاتے تھے اور ان کے کاٹنے سے کبھی اسپتال نہ جانا پڑتا (وہ اس قابل چھوڑتے ہی نہ ہوں گے۔ موقع پر ہی صفایا کر دیتے ہوں گے)۔ اب ہوا یوں کہ کتے جنگل میں رہتے ہوئے اُکتا گئے۔ انھیں خبر ہوئی کہ شہر میں تو بھیڑیوں کے بڑے مزے ہیں۔ بس پھر کیا تھا فوراً منصوبہ بنایا گیا اور اپنے سفیر کو بھیڑیوں سے مذاکرات کے لیے بھیجا۔ اس نے وہاں جا کر کہا کہ ہم لوگ اپنے بھائی کا بیاہ کرنا چاہتے ہیں۔ جنگل میں یہ ممکن نہیں۔ اس لیے ہمیں شہر آنے کی اجازت دی جائے اور بھیڑیے کچھ عرصے کے لیے جنگل جا کر رہنے کی زحمت کریں تا کہ شہر میں آبادی زیادہ نہ ہو جائے اور جنگل سونا نہ ہو جائے۔ بس کسی طرح بہلا پھسلا کر بھیڑیوں کو شہر سے جنگل بھیج دیا اور خود آگئے شہر۔ وعدہ تو یہ تھا کہ جیسے ہی بیاہ ہوگا ویسے ہی آپ کو اطلاع کر دی جائے گی اور جنگل میں ہماری واپسی ہوگی لیکن انہیں تو شہر ایسا بھایا کہ بس یہیں ڈیرا جما لیا۔ اب بچارے بھیڑیے روز اپنے نمائندوں کو جنگل کے کنارے بھیجتے ہیں کہ جا کر پوچھیں بھائی کتوں کی واپسی کا ارادہ کب ہے۔ آج بھی جنگل سے ''ہوا...... ہوا'' کی آوازیں آتی ہیں۔ امی کی پھوپھو کے مطابق یہ ان مظلوم بھیڑیوں کی آوازیں ہیں جو پوچھتے ہیں بیاہ ہوا؟ آہ بیچارے......

☆......☆

فرق تو ہے

کومل فاطمہ اللہ بخش

پاکستان آئے ابھی ہمیں کچھ ہی عرصہ گزرا تھا۔ میٹرک تک تو میں پڑھ چکی تھی۔ آگے بھی پڑھ رہی تھی مگر قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ابو کا کاروبار بحرین میں ختم ہونے کے بعد ناچار ہم کو یہاں آنا پڑا۔ ابو نے میرا داخلہ شہر کے ایک نامور کالج میں کروادیا۔ پہلے تو پاکستان جیسے ملک میں رہنے اور تعلیم حاصل کرنے کے بارے میں سوچ کر ہی عجیب لگتا تھا مگر اب مجھے پاکستان میں رہ کر ہی پڑھنا تھا۔ میں نے آج تک پاکستان کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا تھا دراصل مجھے یہاں کے لوگ پسند نہیں تھے۔ کیونکہ ان میں نہ نظم و ضبط ہے نہ صفائی کا کچھ خیال۔

میرا کالج میں پہلا روز بہت بیزار گزرا اور ہر چیز عجیب معلوم ہو رہی تھی مگر اگلے روز میری ایک لڑکی سے ملاقات ہوئی جو کہ میرے ساتھ ہی پڑھتی تھی اور اس سے میں نے دوستی کرلی۔ وہ دوسروں سے ذرا الگ تھی اور بہت اچھی باتیں کرتی تھی۔ سحر کی ہی وجہ سے مجھے یہاں اچھا لگنے لگا تھا۔

ہماری دوستی کو چند مہینے ہو گئے تھے ایک روز ہم سڑک کنارے سے گزر رہے تھے کہ کسی عمارت کے اوپری فلیٹ سے کچرا گرا۔ میں سحر سے اس طرز عمل پر اظہار خیال کرنے لگی اور خالی جوس کا ڈبہ اُدھر ہی پھینک ڈالا مگر میں نے دیکھا کہ سحر نے اپنے جوس کا ڈبہ بیگ کے پوکٹ میں ڈال دیا۔ میں نے سحر سے پوچھا۔ ”سحر یہ کیا؟ کچرا پھینک دو، بیگ میں کیوں ڈال دیا؟“ وہ کہنے لگی۔

”یہ کچرا پھینکنے کی جگہ نہیں ہے، جہاں پھینکنے کی جگہ ہوگی وہاں پھینکوں گی۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”پاگل لڑکی! یہاں اتنا کچرا ہے تمھارے نہ پھینکنے سے یہ کم تھوڑی ہو جائے گا۔“ وہ ذرا دیر کو مسکرائی اور کہنے لگی۔ ”مجھے پتا ہے میرے نہ پھینکنے سے کچرا کم نہیں ہوگا مگر میرا ضمیر تو مطمئن رہے گا نا کہ اس ساری گندگی میں، میں نے ایک بھی ٹکڑا نہیں پھینکا۔“

سحر کے الفاظ مجھ پر ہتھوڑے کی مانند برس رہے تھے۔ میں نے ہمیشہ دوسروں پر طنز کیا مگر آج تک خود کو نہیں ٹٹولا۔ مگر میری دوست نے کس معصومیت سے مجھے آئینہ دکھا دیا۔

پتا ہے مجھے اب پاکستان اور پاکستان کے لوگ اچھے لگنے لگے ہیں کیونکہ یہاں سحر جیسے لوگ جو رہتے ہیں۔

☆......☆

مگر مچھ

سید عمار احمد، عثمان پبلک اسکول

گہرے نیلے پانی میں ایک خوبصورت دنیا آباد تھی۔ اس دنیا

میں آکٹوپس، کچھوا اور مگرمچھ رہا کرتے تھے۔ مگرمچھ جب بھی پانی سے نکل کر اوپر جاتا تو لوگ اس سے ڈر ڈر کر بھاگنے لگتے، اس کی بدصورت شکل کی وجہ سے۔

یہ چڑیا گھر کے ایک پنجرے کی کہانی ہے۔ دور دور سے لوگ وہاں جانوروں کو دیکھنے آیا کرتے تھے۔ مگرمچھ اکثر دیکھتا کہ بطخوں اور بگلوں کے پنجروں کے آگے ڈھیر سارے لوگ کھڑے ہوتے۔ خوب مزے مزے کی چیزیں ان کو کھانے کو دیتے۔ وہ ان کے ساتھ تصویریں کھنچواتے۔

دوپہر میں جب وہ دھوپ سینکنے کنارے پر آتا تو سفید گردن والی بطخیں اس کو بہت بھاتیں۔ ایک دن وہ رورو کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے لگا: ''یا اللہ! مجھے بھی تھوڑا خوبصورت بنا دیجیے۔'' خوب رورو کر دعا کرنے کے بعد اس کو سکون مل گیا اور وہ سو گیا۔

جب سورج کی تیز گرم شعاعیں اس کی جلد کو جلانے لگیں تو وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ اس کے برابر میں شیشے کا ایک ٹکڑا کہیں سے آ کر گرا تھا۔ سورج کی تیز شعاعیں اس شیشے سے ٹکرا کر اِدھر اُدھر بکھر رہی تھیں۔ اور وہ بہت چمک رہا تھا۔ مگرمچھ نے سوچا کہ اگر اتنا سا ٹکڑا اس طرح چمک سکتا ہے تو وہ خود کیوں نہیں چمک سکتا۔ وہ جلدی سے اٹھا اور سمندری ریت سے رگڑ کر اپنے دانت چمکانے لگا۔ اس کے بعد وہ پانی میں اچھی طرح نہایا۔ پھر شیشے کے ٹکڑے میں اپنا عکس دیکھا تو وہ واقعی خوب صورت ہوگیا تھا اور اس کے دانت چمک رہے تھے۔ وہ کنارے پر ایک جھاڑ کے سائے میں سُریلی آواز کے ساتھ اللہ کا شکر ادا کرنے لگا۔ اچانک ایک بچہ اس کے پنجرے کے قریب آیا اور پاپ کارن اس کے منہ میں پھینک کر چلا گیا۔ وہ اور زیادہ اپنے دانتوں کی نمائش کرنے لگا۔ آہستہ آہستہ اور لوگ بھی اس کے دانتوں کی نمائش دیکھنے کے لیے آنے لگے۔ وہ اس کے پنجرے میں کھانے کی چیزیں ڈالنے لگے۔

اللہ تعالیٰ کو صفائی پسند ہے اور صاف ستھرے کو سب لوگ دوست بنانا پسند کرتے ہیں، چاہے وہ مگرمچھ ہی کیوں نہ ہو۔

☆......☆

اُف وہ صبح میں کبھی نہیں بھول سکتا وہ حسین نظارہ وہ پرندوں کا چہکنا وہ صبح کی تازہ تازہ ہوا جب بھی میں اس دن کو یاد کرتا ہوں تو میرا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔

آج سے تقریباً ۳ سال پہلے کی بات ہے میں اور میرے چند ساتھیوں نے مل ایک منصوبہ بنایا کہ کیوں نہ ایک دن سب مل کر صبح کی سیر کرنے جائیں۔ کیونکہ ہم سب کے اسکولوں کی چھٹیاں چل رہی تھی تو سب ہی اس بات پر راضی ہو گئے۔ اور ہم نے اگلے دن ہی جانے کا فیصلہ کرلیا۔

اس دن میں بہت خوش تھا کیونکہ میں پہلی دفعہ صبح کی سیر کرنے جارہا تھا۔ ایک طرف تو مجھے صبح کی سیر کی خوشی تھی تو دوسری طرف مجھے ڈر تھا کہ اگر صبح میری آنکھ نہیں کھلی تو میں سیر کرنے نہیں جاپاؤں گا۔ اسی ڈر کی وجہ سے میں نے پوری رات نہ سونے کا فیصلہ کیا اور مجھے نیند نہ آئے اس کے لیے میں نے اپنے ساتھ ایک ٹھنڈے پانی کی بوتل رکھی تاکہ اگر مجھے نیند آنے لگے تو میں ٹھنڈا پانی اپنی قمیص پر ڈالوں۔ لیکن اللہ کے فضل و کرم سے اس چیز کی نوبت نہیں آئی کیونکہ وقت کیسے گزرا پتا ہی نہیں چلا۔

صبح ہوتے ہی ہم سب دوست ایک جگہ جمع ہو گئے کیونکہ اس وقت فجر کی نماز کا وقت بہت قریب تھا تو ہم نے سب سے پہلے نمازِ فجر ادا کرنے کا فیصلہ کیا اور مسجد کی طرف روانہ ہو گئے۔ مسجد پہنچتے ہی ہم نے سب سے پہلے وضو کیا اور سب سے پہلی صف میں جا کر بیٹھ گئے۔ کچھ ہی دیر میں جماعت کھڑی ہوگئی اور ہم باجماعت نماز ادا کر کے مسجد سے باہر آگئے۔ ہم اپنی صبح کی سیر کا آغاز کرنے ہی والے تھے کہ اچانک میرے دوست علی نے کہا کہ دوستو کیوں نا ہم اپنی سیر کا آغاز کسی اچھی سی جگہ پر جا کر ناشتہ سے کرتے ہیں۔ ہم سب جانتے تھے کہ علی کھانے پینے کا بہت شوقین ہے لہٰذا اسی انتظار میں تھے کہ اس نے اب تک کھانے پینے کی بات کیوں نہیں کی۔ آخر کار اس نے دل کی بات کہہ دی۔ ہم سب اس کی بات مانتے ہوئے ناشتہ کرنے چلے گئے۔ ناشتے کے بعد ہم پارک کی جانب روانہ ہوئے۔ پارک تک پہنچنے میں زیادہ وقت نہیں لگا کیونکہ پارک وہاں سے نزدیک ہی تھا۔ پارک میں پہلا کام چہل قدمی کا کیا کیوں کہ ناشتہ جو ہضم کرنا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ٹھنڈی ہوا کا لطف اٹھانے لگے اور کچھ نے کسرت کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہم میں سے کچھ کو کسرت آتی تھی تو کچھ نے نام ہی پہلی دفعہ سنا تھا اسی لیے سب دوستو نے مجھے کسرت کا اُستاد بنادیا تاکہ میں سب کو صحیح کسرت کرواسکوں۔

پھر میں نے کسرت کرنا شروع کردی اور تقریباً آدھے گھنٹے تک کسرت کرنے کے بعد ہم لوگ ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔

اچانک علی بولنے لگا کہ دوستوں تم لوگوں کو کوئی آواز آرہی ہے ذرا غور سے سنو۔ یہ آواز وہاں پر موجود درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندوں کی تھی۔ جو اللہ تعالی کی حمد وثنا کررہے تھے۔ ان کی آواز سن کر ہم سب کا دل باغ باغ ہوگیا۔ اس دن کی تازہ ہوا پرندوں کا چہکنا، صبح صبح کا ناشتہ اور کسرت وغیرہ سے ہمارا جسم تروتازہ ہوگیا اور ہمارا جسم ایسا ہوگیا جیسے کسی نے Delete کا بٹن دبا کر ہماری ساری پریشانیاں دور کردی ہوں۔ کچھ ہی دیر میں ہم لوگ اپنے اپنے گھر روانہ ہوگئے۔ کیونکہ میں پوری رات نہیں سویا تھا اسی لیے میں جاتے ہی سوگیا اور تقریباً سات سے آٹھ گھنٹے سونے کے بعد میں نے اٹھ کر کھانا کھایا اور صبح کی سیر کے بارے میں اپنے امی اور ابو کو بتایا۔ میری باتیں سن کر ان کا دل اتنا خوش ہوا کہ اُنھوں نے بھی صبح کی سیر کا ارادہ کیا۔

☆......☆

ہمارا آئیڈیا

آمنہ احمد بنت سفیر
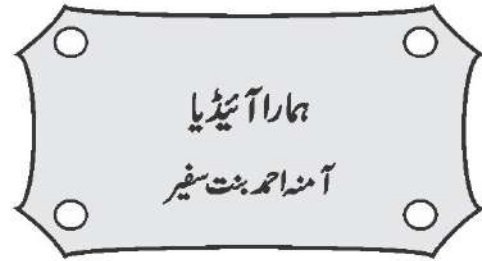
ہمارے ذہن میں عرصے سے آئیڈیا کلبلا رہا تھا۔ سوچا...... چلو آج یہ بھی ساتھی ٹیم کے گوش گزار کردیتے ہیں۔ آج کے زمانے میں مہنگائی اتنی بڑھ چکی ہے کہ غریب طبقے کے والدین چاہتے ہوئے بھی اپنی اولاد کو تعلیم نہیں دلا سکتے اسی سبب کتنے ہی بچے ہیں جو تعلیم حاصل نہیں کرسکتے۔ وہ گلی گلی کچرا چنتے ہیں، مکینک کی دکانوں پر بیٹھے گاڑیاں ٹھیک

کرتے ہیں، چھوٹے ہوٹلوں میں بیرے بنے کام کرتے ہیں، سڑکوں میں گاڑیوں کے شیشے صاف کرتے ہیں، گندے نالے صاف کرتے ہیں اور یہی بچے...... جن کی عمر پڑھنے لکھنے اور کھیلنے کی ہوتی ہے۔ اپنے گھر کی کفالت کرنے کے لیے سخت گرمی میں بھی تندور میں روٹیاں لگاتے ہیں تو سخت سردی میں بھی گاڑی کے شیشے صاف کرتے ہیں۔

ان بچوں کو دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ یہ بچے تو مستقبل کے معمار ہوتے ہیں۔ انھیں تو ملک کی تعمیر کرنی ہوتی ہے۔ پھر یہ پڑھ لکھ کیوں نہیں سکتے، حالانکہ اگر ہم لوگ چاہیں تو ان کے لیے بہت کچھ کرسکتے ہیں۔

اس ملک میں کئی تعلیمی ادارے ہیں اگر کوئی اسکول ایسا ہو جہاں بچوں کو ہلکا پھلکا ہنر سکھایا جائے۔ زیادہ سے زیادہ ایک سال! پھر وہ بچے اپنی بنائی ہوئی چیزیں انتظامیہ کو دیں، اس بنا پر بچوں سے فیس نہیں لی جائے گی بلکہ ان چیزوں کو آگے بیچا جائے گا۔

اب وہ چیزیں...... جو بچے باآسانی بنا سکتے ہیں۔ وہ کاغذی

پھول جو ٹشو پیپر سے خوبصورتی سے بن سکتے ہیں۔ لکڑی سے بنائے گئے ڈبے جن کی آرائش رنگوں وغیرہ سے کی جاسکتی ہے۔ ہاتھ سے بنائی گئی جیولری، جو موتیوں سے بنائی جاتی ہے۔ خالی بوتلوں سے بنائے گئے گلدان، خالی شیشے کے جار کی آرائش کر کے اسے پین ہولڈر بنایا جاسکتا ہے۔ انڈے کے چھلکوں سے گڑیاں، عام کپڑے پر بٹنوں اور دیگر چیزوں سے مزین چھوٹے چھوٹے پرس...... اور بھی بے شمار چیزیں ہیں۔ یہ با آسانی آگے بک جاتی ہیں۔ ان چیزوں کی وجہ سے بچے ہنر بھی جان جائیں گے اور تعلیم بھی حاصل کر سکیں گے۔

یہ ادنیٰ سا آئیڈیا ہے۔ ہماری بڑی خواہش ہے کہ یہ پورا ہو، اس کی بدولت کئی بچے تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوسکتے ہیں۔

☆......☆

کیا آپ کو آپ کا انعام ملا؟

یقیناً آپ نے اپنا پتا مکمل نہیں لکھا ہوگا...... یا پھر......!!

آپ اپنا رابطہ نمبر لکھنا بھول گئے ہوں گے

انعام نہ ملنے کی یہی دو صورتیں ہوسکتی ہیں۔ امید ہے آئندہ آپ ان باتوں کا خیال رکھیں گے۔ اگر آپ ان باتوں پر عمل کریں گے تو آپ کا انعام آپ کو ضرور موصول ہوگا۔

نوٹ: نامکمل پتا اور رابطہ نمبر نہ ہونے کی صورت میں واپس آنے والے انعام دوبارہ نہیں بھیجا جائے گا۔ (ادارہ)

باغ کا مالی

قدسیہ ملک، جامعہ کراچی

میں ہوں آپکے باغ کا مالی
کام ہے پودوں کی رکھوالی
زمیں کا ٹکڑا جو ہو خالی
اس میں اپنی محنت ڈالی
کرتا ہوں میں دھوپ میں کام
دیتا ہوں سب کو آرام
سیب خوبانی چیری آم
خربوزہ ، تربوز اور جام
بڑے بڑے پودوں کے نام
محنت سے سب ہوگئے رام
خشک بنجر زمین پہ جاؤں
پھر اس پہ میں سبزہ اُگاؤں
پیاس میں ان کی روز بجھاؤں
محنت اپنی یوں دکھلاؤں
بیلی، موتیا اور گلاب
آجائے جب ان پہ شباب
خوش ہوں دیکھ کے سب احباب
بنجر زمیں ہو گئی سیراب

☆......☆

خط.... رے

حافظہ رومیسہ اسحاق عرصے بعد تشریف لائی ہیں

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!

آپ میری خوشی کا اندازہ بھی نہیں کرسکتے۔ جو تقریباً ایک سال بعد ساتھی رسالے کو اپنے گھر میں موجود پا کر ہوئی۔ نا جانے کہاں سے بھولتا بھٹکتا ہوا ساتھی آج یہاں آدھمکا ہے۔ جس پر ہمیں بھی کافی حیرت ہے۔ پڑھائی اور دیگر مصروفیت کی بنا پر ماہنامہ ساتھی سے کافی وقت سے ناتا ٹوٹا ہوا تھا۔ مگر ہم اپنے بہت ہی عزیز اور پیارے سے ماموں سلمان کے شکر گزار ہیں کہ جن کے بار بار توجہ دلانے سے آج ہم نے تمام کاموں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے پیارے ننھے منے (عمر کے لحاظ سے نہیں) کمزور ونحیف مگر بہت ہی عزیز رسالے کے لیے آج دوبارہ سے قلم اُٹھالیا ہے۔ امید ہے ساتھی اپنے پرانے ساتھی کو پخیر راغلے میرا مطلب ہے خوش آمدید کہیں گے۔ دسمبر کی سردی اور الیکشن کی مہم کو دیکھتے ہوئے سرورق ایک دَم بہترین ہے۔ بیچاری اسماء خالہ (ماہم جاوید) ایک ہنستی مسکراتی تحریر ہے اور ہاں ماہم جی ہماری جانب سے بھی ڈھیر ساری مبارک باد وصول کیجیے۔ 'اُردو زباں ہماری' پڑھ کر تو لکھتے ہوئے کچھ کچھ ڈر محسوس ہو رہا ہے۔ مگر ہم بھی ٹھہرے کافی ڈھیٹ اتنی آسانی سے ہار ماننے والے کہاں؟ کسی شاعر کا ایک بھولا بھٹکا شعر ہے۔ ذرا کھلکھلائیے میں دو ایک لطائف ہی پسند آئے۔ اچھا ہی ہے ہمیں مزاح میں زیادہ دلچسپی نہیں۔ ورنہ ایسے ایسے لطائف سناتے کہ قارئین ساتھی ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ بس اب کیا کریں۔ (رہنے دیں ہر کوئی یہی کہتا ہے) 'پُراسرار قلعہ' ہمارے خیال سے شمارے کی نمبرون کہانی ہے۔ شاید کسی کو ہماری بزدلی پر ہنسی بھی آئے مگر آپس کی بات ہے۔ یہ کہانی پڑھتے ہوئے ہمارے ہاتھ ایک دم ٹھنڈے ہو گئے تھے اور ہر آہٹ پر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ڈریکولا کے ٹارگٹ ہم ہی ہیں۔ ہماری چھوٹی بہن اُمّ ماریہ کو 'رنگا کی شرارت' کہانی بہت پسند

آئی۔ ’جیتے گا بھئی جیتے گا‘ ایک کھلکھلاتی ہوئی تحریر ہے۔ ’ضرورت ہے روم میٹ کی‘ پڑھ کر دل نے کہا ہمارے پاس بھی ہونی چاہیے ایک عدد بلی۔ مگر فوراً ہی اگلا خیال آیا کہ پھر تمہارے ان معصوم چوزوں کا کیا ہوگا جو تم نے پچھلے ہفتے لیے ہیں۔ سو پلان کینسل۔ ’جیومیٹری چور‘ اس کہانی میں ایک بہت اہم سبق چھپا ہوا ہے۔ ’شام سے پہلے‘ ایک بہت ہی اعلا کاوش ہے۔ جس نے ۱۶ دسمبر کی وہ سر یادیں تازہ کردیں۔ اس مختصر سے پرزے میں تمام تحاریر پر تبصرہ کیا جائے۔ یہ تو ہمارے دھان پان سے ساتھی کے ساتھ کافی زیادتی ہو جائے گی اور ہاں چلتے چلتے ایک بات اور ’تاریخ کی کھوج‘ بہت ہی عمدہ سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ جو کہ بچوں کی اسلامی معلومات میں اضافے کا سبب بنے گا۔

ناہید ضمیر حسین کھوسہ بڑی چالاکی سے جواب لینے کے حصول میں کامیاب ہو ہی گئیں

دسمبر کے اس شمارے میں تو مزہ ہی آ گیا۔ کیا کہانیاں تھی۔ اس شمارے کی یہ کہانیاں بہت اچھی تھی۔ ’چاچا ہادی نے ناول لکھا‘، ’رنگا کی شرارت‘، ’جیتے گا بھئی جیتے گا‘ اور جیومیٹری چور...... سب کہانیاں اتنی اچھی تھی کہ کیا بتاؤں۔ انکل کیا میں بھی کہانی بھیج سکتی ہوں۔

☆......جی آپ اپنی کہانیاں بھیج سکتی ہیں۔

ارم بلوچ محمد رفیق اپنے پیارے سے خط کے ساتھ حاضر ہیں

دسمبر کا مہینہ ہمارے لیے دو دو خوشیاں لے کر جلوہ افروز ہوا۔ ایک تو یہ کہ ہم نے ششماہی امتحانوں میں اول پوزیشن کے ساتھ کامیابی حاصل کی (بہت بہت مبارکباد) اور دوسری یہ کہ دسمبر کے شمارے میں ہمارا خط بھی ساتھی کی زینت بنا۔ خیر خوشی اور تجسس کے ملے جلے جذبات میں ساتھی پڑھنا شروع کیا۔ سرورق کہانی نے ہمیں خوب متاثر کیا جس کے نتیجے میں ہم جلد ہی انتخابات کروانے کی تیاری میں مصروف ہیں۔ ساتھی چٹخارے میں فاطمہ نور صدیقی کو دیکھ کر خوشی ہوئی اور جلد صفحہ ۵۲ کھول کر کہانی پڑھنے لگے۔ کہانی پڑھتے ہوئے جلد ہی تجسس کے بھنور میں ڈوب گئے۔ واہ وا! بہت خوب لکھا آپ نے۔ اس کے بعد چچا ہادی کے کارنامے پڑھے اور یہ پڑھ کر افسوس ہوا کہ چچی صاحب نے ناول ہی انگیٹھی میں جھونک دیا ویسے اگر چچا انہیں پہلی ہی خبر کر دیتے تو ان سے یہ اناڑی پن سرزد نہ ہوتا۔ جس تحریر کی ہمیں پہلے ہی تعریف کر دینی چاہیے تھی اب ہم اس کا نام بتا دیتے ہیں۔ ’شام سے پہلے‘ (الطاف حسین) جس شاندار انداز سے انھوں نے یہ تحریر لکھی۔ اس کی کیا ہی تعریف کی جائے۔ بلاشبہ یہ تحریر اس سال کی بہترین تحریروں میں سے ایک تھی۔ اب ذرا بات کرتے ہیں اپنی ماہم جاوید صاحب کی تحریر کی۔ ایک بات تو بتائیں کیا یہ گھر حقیقت والا گھر تھا؟ میرا مطلب ہے کھلونے والا گھر تو نہیں تھا، جب ہی تو ہر چیز ٹوٹی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ ایک بات تو ہم مانتے ہی ہیں کہ آپ کمال کا مزاح کرتی ہیں۔ ’رنگا کی شرارت‘ کہانی بچوں کے لیے تھی سو کچھ زیادہ پسند نہ آئی۔ ’ضرورت ہے روم میٹ کی‘ میں چشتی صاحب نے چڑیا گھر کے سارے جانور ساتھی میں لا کھڑے کیے۔ ’جیومیٹری چور‘ کہانی چوروں کے لیے ایک اچھا نسخہ تھی۔ ’ہیرے کی چوری‘ پر ہم کوئی تبصرہ نہیں کریں گے، کیونکہ اس کا مرکزی خیال کہیں پڑھا ہے۔ آپ کی تخلیق میں ’بشریٰ ہاشمی صاحبہ‘ داد کی مستحق ہیں یقیناً انھوں نے خوب دماغ لڑایا ہوگا۔ خطارے میں ناہید ضمیر حسین کھوسہ کے دو دو خط لگا دیے ہیں آپ نے۔ رمشاء جاوید کو ایک عرصے کے بعد خط...... رے میں موجود پایا اور ’الیاس نواز‘ اور ’سمیرا امیر‘ کے خط پسند آئے۔

کومل فاطمہ اللہ بخش کے خط میں مشکل سے ہی کوئی لفظ کٹتا ہے...... وہ لکھتی ہیں

دسمبر کا ساتھی عجیب منظر پیش کر رہا تھا جس میں تقریباً سب دانتوں کی نمائش کر رہے تھے۔ زیادہ اچھا نہ لگا۔ مگر اندرونی سرورق بڑا پیارا تھا۔ ’دل پہ دستک‘ اچھے طریقے سے سمجھ آئی۔ ساتھی چٹخارے میں جاوید بسام کی کہانی ’چاچا ہادی نے ناول لکھا‘ بڑی دلچسپ اور مزے دار تھی مگر افسوس بھی ہوا بیچارے چچا کا ناول ضائع ہو گیا۔ ’بیچاری اسماء خالہ‘ (ماہم جاوید) کہانی تو اچھی تھی مگر ایک بات سمجھ نہیں آئی کہ جب گھر والوں کو معلوم تھا کہ گھر میں چیزیں خراب ہیں تو خالہ کو تین دن کے لیے اپنے گھر مدعو کیوں کیا؟ کیا کوئی پرانی دشمنی کا بدلہ لینا تھا؟ خیر جو بھی کہانی میں بتایا گیا ہم اس سے لطف اندوز بہت ہوئے۔ ’پراسرار قلعہ‘ (فاطمہ نور صدیقی) کی وحشت نے تو ہم کو بھی ڈرا دیا۔ بہت تجسس تھا، پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ ’شام سے پہلے‘

(الطاف حسین) شروع میں تو سمجھ نہیں آئی مگر پڑھتے گئے سمجھتے گئے۔ بہت بڑا سبق دیا گیا اس کہانی میں۔ 'جیتے گا بھئی جیتے گا' (حماد ظہیر) بڑی کھلکھلاتی تحریر ثابت ہوئی مگر آخر میں لکھا ہوا تھا کہ 'بھیا کو ہم نے انکساری سے آنسو پونچھتے دیکھا۔ سمجھ نہیں آیا کہ جو جیتا ہے وہ رو کیوں رہا ہے اسے تو قہقہے لگانے چاہییں اور جب بلال سہیل کی کہانی ہم نے 'آپ کی تخلیق' سے باہر دیکھی تو خوشی بھی ہوئی اور افسوس بھی۔ خوشی اس بات پر کہ محترم بلال سہیل صاحب ترقی کر گئے اور ہم ان کو اس بات پر مبارکباد بھی پیش کرتے ہیں اور افسوس خود پر کہ ہم ابھی تک کچھ خاص اچھا نہ لکھ پائے۔ خیر 'ہیرے کی چوری' اچھی تھی۔ 'اُردو زباں ہماری' (اطہر علی ہاشمی) تو میرا پسندیدہ سلسلہ ہے جس سے ہماری اُردو کے متعلق چھوٹی چھوٹی اور اہم معلومات بڑھتی جا رہی ہیں۔ نظموں میں 'اے میری گائے' (احمد حاطب صدیقی) بہت اچھی تھی۔ اس نظم کو پڑھنے میں بہت مزا آیا 'جھولی بھر پاؤ گے' (محمد امتیاز عارف) خوبصورت نظم تھی۔ آپ کی تخلیق میں 'وہ ملے تو' بشریٰ ہاشمی کی تحریر میں جو ملاقات بتائی گئی جو شاید ہی ہم نے کہیں اور ملاحظہ فرمائی ہو۔ بہت شاندار تحریر تھی۔ 'حمد باری تعالیٰ' (نیاز خان اعوان) پیاری حمد تھی۔ 'ہمارے اساتذہ' (مریم جمیلہ عتیق) بھی اچھی کاوش رہی۔ ایک بات معلوم کرنی تھی یہ جو ہم خط لکھتے ہیں ان کو کون پڑھتے ہیں اور جوابات دیتے ہیں؟ آپ نے بطور انعام پچھلے سال مجھے چند کتابیں بھیجی تھیں ان میں ایک اختر عباس کی کتاب 'آداب زندگی' بھی تھی۔ جس کے آخری صفحے پر اشفاق احمد کی کتاب کے بارے میں رائے درج تھی اور اس میں سال ۲۰۱۳ء لکھا تھا مگر اشفاق احمد صاحب کا انتقال تو ۲۰۰۴ء کو ہو گیا تھا اور جس طرح اشفاق احمد لکھتے تھے ویسے ہی لکھا ہوا ہے، میں نے غور بھی کیا تو ذرا اُلجھن محسوس ہوئی۔ ہو سکے تو میری رہنمائی کیجیے گا اس معاملے میں۔

☆......آپ کی خط پڑھنے والی بات بہت اہم ہے لیکن اس پر پردہ ہی رہنے دیں تو اچھا ہے۔ آپ کی دوسری بات کا جواب یہ ہے کہ اشفاق صاحب کا انتقال ۲۰۰۴ء ہی میں ہوا تھا اور اُنھوں نے شیزان دی مال، لاہور اکتوبر ۱۹۹۷ء میں 'آدابِ زندگی' کی تقریبِ پذیرائی کے موقع پر یہ بات کہی تھی۔

دسمبر کے شمارے پر نائلہ صدیقی اپنی قیمتی رائے دیتے ہوئے رقم طراز ہیں

نومبر کے شمارے (سالنامہ) پر تبصرہ لکھنے میں اتنی کاہلی کی گئی کہ دسمبر کا شمارہ آن پہنچا، ساتھی والے ہماری طرح کاہل نہیں ہیں ناں۔ تو سوچا کہ کیوں نہ اس شمارے پر بھی اپنی رائے دے دی جائے۔ سرورق رنگین اور خوش نما ہے مگر جو رنگ استعمال کیے گئے ہیں وہ نومبر کے شمارے کے سرورق سے قریب قریب ہیں۔ شمارے کی سب سے دلچسپ کہانی حماد ظہیر کی 'جیتے گا بھئی جیتے گا' ہے۔ یہ نہ صرف ایک پُر لطف تحریر ہے بلکہ اس کے اندر چھپا ہوا پیغام بھی اپنے اندر ایک جہانِ معنی رکھتا ہے، اگر کوئی سمجھے تو! جاوید بسام کی کہانی نے چچا چھکن کی یاد تازہ کر دی۔ ماہم جاوید کی 'بیچاری اسماء خالہ' بھی ایک مزے دار کہانی ہے۔ ان کے قلم میں بھی روانی آتی جا رہی ہے۔ مگر ماہم نے یہ نہیں بتایا کہ گھر میں پھیلی افراتفری، ابتری اور ٹوٹ پھوٹ کی وجہ گھر والوں کی غفلت اور پھوہڑ پن تھا یا صرف صدقہ نہ دینے کی نحوست تھی؟ فاطمہ نور صدیقی کی 'پُراسرار قلعہ' توجہ مبذول کرانے والی تحریر ہے۔ کیا یہ ترجمہ ہے؟ ترجمے سے یاد آیا کہ 'ضرورت ہے ایک روم میٹ کی'، ایک مزے دار تحریر ہے۔ نظموں میں احمد حاطب صدیقی اور ضیاء الحسن کی نظمیں چھا گئیں۔ مضامین کے حصے میں غلام مصطفیٰ سولنگی نے نہایت مربوط اور رواں انداز میں جامع مسجد (روہڑی) کے بارے میں قارئین کی معلومات میں اضافہ کیا ہے۔ 'شام سے پہلے' (الطاف حسین) کی ایک متاثر کن تحریر ہے۔ دشمن کا تعاقب کرنے کی جو تراکیب اور طریقے ہمیں بتائے گئے ہیں، ان میں سے کسی پر بھی کم از کم کراچی میں عمل نہیں ہو سکتا۔ یہاں کی بھری پری ٹریفک جام کا شکار سڑکوں پر ہم نہ بلی کی طرح رینگ سکتے ہیں نہ ٹانگ کو گھٹنے سے موڑ کر آگے بڑھ سکتے ہیں۔ ہاں یہ بات ہم نے سیکھ لی ہے کہ جب بھی دشمن کا تعاقب کرنے جائیں تو بھورے رنگ کی ٹوپی لگا کر جائیں، کراچی کی آلودگی ویسے بھی ہر سفید چیز کو بھورا کر دیتی ہے۔ خیر اب تلاش ہے ایک دشمن کی جس کا تعاقب کر کے ہم ان طریقوں کی افادیت جان سکیں۔ ٹوپی ہم نے خرید لی ہے۔ رنگین صفحات شمارے کی رونق میں اضافہ کر رہے ہیں۔ 'رنگا کی شرارت' کم عمر

ساتھیوں کے لیے بہت دلچسپ اور خوش نما تحریر ہے۔

ساتھی کے چلبلے قاری محمد عمر بن عبدالرشید لکھتے ہیں

پندرہ نومبر کو ایکسپو سینٹر پہنچے تو وہاں ہمیں بار بار ایک ہی آواز آ رہی تھی۔ میں یہاں ہوں۔ ہال نمبر ۲ میں۔ یہ آواز کچھ جانی پہچانی سی لگی۔ لیکن یاد نہیں آ رہا تھا کہ کس کی آواز ہے۔ جب ہال نمبر ۲ میں پہنچے تو سامنے ساتھی کا اسٹال پایا اور یہ آواز بھی ساتھی کے اسٹال سے آ رہی تھی اور یہ آواز دسمبر ۲۰۱۵ء کے ساتھی کی تھی۔ ہمارا بس چلتا تو تمام ساتھی خرید لیتے لیکن جب اپنے ماموں کو دیکھا کہ وہ ایسے حیرت سے ہمیں دیکھ رہے تھے اور ایسا لگا کہ وہ کہنا چاہ رہے ہوں ابھی اور اسٹال بھی باقی ہیں۔ دسمبر کا شمارہ نہایت شاندار تھا۔ خطرے میں اپنا خط دیکھ کر خوشی ہوئی اور اپنی ڈرائنگ دیکھ کر بھی خوشی ہوئی۔ دل پہ دستک اور السلام علیکم کو ذہن نشین کرنے کے بعد چٹخاروں کی دنیا میں کھو گئے۔ 'چچا ہادی نے ناول لکھا' پڑھ کر مسکرا اٹھے۔ 'دشمن کا تعاقب' اب ہمارا کوئی دشمن ہے ہی نہیں۔ ہاں ردی کی ٹوکری ہے۔ پراسرار قلعہ پڑھ رہے تھے کہ اچانک اپنے آپ کو ڈرائنگ روم میں اکیلے پایا ہم سوچنے لگے کہ اب ڈریکولا ہمارے سامنے آ نہ جائے اس لیے وہاں سے بھاگ نکلے۔ کہانی میں تجسس کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ہمیں پہلے سے ہی پتا تھا کہ کسی کی تحریر شائع ہو یا نہ ہو لیکن ظفر شمیم ہمیشہ کی طرح حاضر ہوں گے۔ حماد ظہیر کی کہانی 'جیتے گا بھئی جیتے گا' بہترین تھی۔ 'جیومیٹری چور' پڑھ کر پچھلے سال کا سانحہ یاد آ گیا جو کہ ہمارے اسکول میں پیش آیا تھا ایک کم بخت بچوں کا گروہ وقفے کے دوران بچوں کے جیومیٹری چوری کر لیتا جس میں ہمارا معصوم سا جیومیٹری بکس بھی شامل تھا پتا نہیں اس بے چارے پہ کیا گزری ہوگی لیکن وہ بھی پکڑے گئے۔ 'مناف کی گمشدگی' پیاری کہانی تھی۔ 'بیچاری اسماء خالہ' پڑھ کر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ 'اردو زباں ہماری' سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ 'رنگا کی شرارت' ننھے منوں کی کہانی تھی لیکن وہ بھی پسند آئی۔ 'ذرا کھلکھلائیے' کھلکھلانے کے قابل تھا۔ ساتھی مصوری کا صفحہ پسند آیا۔ شام سے پہلے زبردست کہانی تھی۔ 'ضرورت ہے روم میٹ کی' بھی پسند آئی۔ 'ہیرے کی چوری' بھی کچھ کم نہیں تھی۔ خطرے پڑھ کر انگلیاں چاٹتے رہ گئے۔ نظمیں تمام بے حد پسند آئی۔ اب بیٹھے ہی چلے 'آپ کی تخلیق' کی طرف 'وہ ملے تو' پڑھ کر ہنسی آئی، 'ہمارے اساتذہ' پڑھ کر مسکرا اٹھے، 'اریبہ کے چوزے' اچھی کہانی تھی۔ 'غلطی کا ازالہ' بھی کچھ کم نہیں تھی 'حمد باری تعالیٰ' بھی بازی لے گئی۔

عمر کا پیچھا کرتے کرتے محمد اسماعیل عبدالرشید بھی چلے آئے ہیں۔

دسمبر کا ساتھی ہمیں ۱۵ نومبر کو ہی مل گیا تھا ایکسپو سینٹر سے، اس لیے آرام سے پڑھا۔ عامر کی سائیکل پر سوار ہوئے اور چچا ہادی کے ناول کے اختتام میں شریک ہوئے اور آخر میں ناول کے اصل اختتام میں بھی شریک ہوئے۔ 'مناف کی گمشدگی' پڑھی۔ 'بیچاری اسما خالہ' کا حال دیکھا جو کہ سچ میں بہت ہی زیادہ بے چاری تھی اور تصویروں سے بھرپور 'رنگا کی شرارت' اچھی تحریر تھی۔ ہم بھی پراسرار قلعہ میں گئے اور روشنی کا راز جان کر نکلے وہ بھی لائبریری سے۔ 'شام سے پہلے' میں اگر عبدالحق ثانیہ سے گڑیا چھین کر نہ بھاگتا تو اس کا ضمیر اسے کبھی بھی چین سے جینے نہ دیتا اور ویسے بھی عبدالحق شام سے پہلے ہی گھر لوٹا تھا۔ 'ضرورت ہے روم میٹ کی' میں ایلی سن کو ایک پرفیکٹ روم میٹ ملا۔ 'جیومیٹری چور' میں اگر شاہد اور فرقان مبین، علی اور زبیر کو اچھائی کا راستہ نہ دکھاتے تو وہ کبھی بھی جیومیٹری بکس واپس نہ کرتے اور معافی نہ مانگتے۔ 'ہیرے کی چوری' بھی ایک اچھی کہانی تھی۔

سید محمد شارق ابرار شجر لکھتے ہیں......

دسمبر کا سرورق بہت دلکش تھا۔ تمام کہانیاں شاندار اور جاندار تھیں۔ 'ہیرے کی چوری' شاید کسی رسالے میں پڑھ چکے ہیں۔ 'پراسرار قلعہ' میں ایس او ایس کے سگنلز کسی ترتیب 'ایک بار...... دوسری بار...... تیسری بار' یا پھر 'ایک بار...... دوبار...... تین بار' ہوتا تو صحیح لگتا۔ ساتھی کے قارئین کے علم میں اضافے کے لیے عرض ہے کہ بور کا مطلب ہماری ڈکشنری میں 'اُکتا دینے والا' ہے۔ سانحہ پشاور کے لحاظ سے کوئی تحریر ہوتی تو بہتر تھا۔

سہراب گوٹھ سے محترمہ اُمّ عادل تشریف لائی ہیں

محترم ماہ نومبر میں آپ سب کی دو بہترین کاوشیں۔ساتھی سالنامہ،اور ایوارڈ تقریب و بچوں کا مشاعرہ ہیں۔دونوں کاوشیں آپ اور آپ کے رفقاء کی شب و روز محنتوں کا منھ بولتا ثبوت ہیں اور دونوں کاوشیں لائق تحسین ہیں دونوں کے لیے دلی مبارکباد قبول کیجیے۔اس ناچیز کو بھی آپ نے ایوارڈ تقریب میں مدعو کر کے یاد رکھا جس کے لیے بہت بہت شکریہ۔کچھ ذاتی مصروفیات کی بنا پر ۲۰۱۴ء میں میں آپ کے ماہ نامے سے کوئی خاص قلمی تعاون نہ کر سکی جس کے لیے معذرت مگر امید ہے آئندہ جس حد تک ممکن ہوا قلمی تعاون جاری رکھنے کی بھرپور کوشش جاری رہے گی۔مشاعرہ بہت اچھا تھا۔

خط کی کاٹ پیٹ سے عائشہ ناصر بھی ناراض ہیں لیکن ہماری مجبوری......بھی تو کوئی سمجھے!

سرورق الیکشن کے دنوں کی منظر کشی کر رہا تھا۔ایسا لگ رہا تھا کہ الیکشن کے دنوں کا جنگ و جدل ساتھی کے سرورق میں سمٹ آیا ہے۔'دل پہ دستک' سے شاہین کی طرح بلند کردار بننے اور 'السلام علیکم' سے جہد مسلسل کا درس دے کر ہم کہانیوں کی طرف بڑھے۔'چچا ہادی نے ناول لکھا' ان مصنفین کی مشکلات کو ظاہر کر رہی تھی جن کے گھر والے ان کی انمول تحریروں کو بے مول سمجھ کر آگ میں جھونک دیتے ہیں اور مصنف بے چارے ہاتھ ملتے رہ جاتے ہیں۔'مناف کی گمشدگی' شرک کی گہرائیوں سے توحید کی بلندیوں تک کے عظیم سفر کی داستان سنا رہی تھی۔'دشمن کا تعاقب' دلچسپ مضمون تھا۔ جاسوسی کے اہم گر سکھا گیا۔'بے چاری اسما خالہ' میں خالہ نے مصائب سے بچنے کا آسان حل بتایا۔'پراسرار قلعہ' ہم پہلے پہل بڑی پراسرار کہانی لگی لیکن بعد میں عام سی کہانی ثابت ہوئی۔'جیتے کا بھئی جیتے گا' میں حماد ظہیر صاحب نے کیا شفاف الیکشن کروائے۔ہمارے ہاں تو الیکشن کرپشن کا دوسرا نام ہے۔'شام سے پہلے' نے مشرقی پاکستان کی جدائی کا دکھ تازہ کر دیا۔ڈھاکہ خود تو ڈوب گیا لیکن اپنے ساتھ سیکڑوں زندگیاں بھی لے ڈوبا۔ 'ضرورت ہے روم میٹ کی' ایک عجیب سی کہانی تھی۔ مجھے پسند نہیں آئی۔'جیومیٹری چور' میں مذہبی فریضہ یاد دلا رہی تھی جسے ہم آج فراموش کر چکے ہیں اور اس کا نتیجہ جرائم میں دن بدن اضافہ کی صورت میں بھگت رہے ہیں۔ایک جاندار اور ایک بے جان کی گمشدگی کی کہانی 'ہیرے کی چوری' قابل تعریف تھی۔'آپ کی تخلیق' میں 'ہمارے اساتذہ' اور 'ہم ملے تو' اچھی تحریریں تھیں۔

ڈپٹی نذیر احمد سے متاثر بنت محسن لکھتی ہیں

قارئین حضرات،تعریفوں کی ہے برات،دلچسپیوں کی تھی جو سوغات،دل کو بے حد بھائی،ذہن کو پسند آئی،الغرض تن و من پہ چھائی اور خواہش یہ اُمڈ آئی کہ ہم قلم اٹھا لیں اور تبصرہ لکھ ڈالیں۔اور سب کو بتا دیں کہ ہم کتنا چاہیں اپنے پیارے ساتھی کو اور ہم چاہیں اس کو پوری دنیا پڑھے اور اس سے سیکھے۔اچھے اچھے آداب اور اسلامی تعلیمات،تو یہ تھی وہ بات جو کرنی تھی سب کے ساتھ......بس بھئی تھک گئی اور شاعری نہیں ہو رہی۔(آغا حشر کے ڈراموں میں ایسے مکالمے آپ کو بکثرت ملیں گے) خیر! مجھے کون سا شاعری کرنی ہے،میرا مقصد تو تبصرہ کرنا ہے کیوں کہ ساتھی اس دفعہ میرے ہاتھ میں سلامت ہے ورنہ یا تو وہ میری کسی سہیلی نے لیا ہوا ہوتا ہے یا میری چھوٹی بہن صاحبہ پڑھنے کے فوراً بعد اسے ریزہ ریزہ کر دیتی ہیں۔خیر یہ تو کافی دردناک نقشہ کھینچا مطلب ایک دو سرورق نکال دیتی ہے جس میں سرورق ہمیشہ سرفہرست ہوتا ہے اچھا جی فی الحال تو میری نظر 'دل پہ دستک' پر ہے جو واقعی بہت اچھا لگا پڑھ کر اور ''چچا ہادی نے ناول لکھا' تو اس بھی اچھا لگا پڑھ کے...... ہاں 'مناف کی گمشدگی' کے بارے میں 'شرارت نمبر' میں جو تحریر تھی وہ لاجواب تھی تو اس مقابلہ میں یہ ذرا اتنی مزیدار نہ تھی۔'جامع مسجد موئے مبارک' کے بارے میں پڑھ کر بہت اچھا لگا۔'بیچاری اسماء خالہ' تو بہت ہی زبردست تھی۔'اطہر علی ہاشمی' کے تبصرہ تو ہوتے ہی زبردست ہیں آخر کون سا خوردبینی چشمہ لگا کر ایسی چنی منی غلطیاں نکالتے ہیں سمجھ سے باہر ہے۔'رنگا کی شرارت' پڑھی تو دل خوش ہو گیا۔اس طرح کی کارٹون کہانیاں بہت اچھی لگتی ہیں پتا نہیں آپ لوگوں نے کیوں دینا چھوڑ دی تھیں؟ 'اے میری گائے' پڑھ کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ویسے 'ذرا کھلکھلایئے' میں انعامی مقابلہ کی بدولت کافی نئے نئے لطیفے پڑھنے میں آرہے ہیں جو ایک

بہت اچھی تبدیلی ہے۔ 'پراسرار قلعہ' نے تو واقعی گرفت میں لے لیا تھا کہ ہم سمجھے واقعی کوئی خوفناک کہانی ہے۔ سب چھوڑیں آپ بس یہ بتادیں کہ اتنی پڑھی لکھی بطخ کہاں سے مل گئی آپ کو؟ اور ساتھی مصوری کی خواہش کو آپ لوگوں نے پورا کر دیا۔ 'جیتے گا بھئی جیتے گا' میں تو پہلی دفعہ میں ہی نبیل بھائی کے حق میں ہوگئی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ میں چاہ رہی تھی کہ فوزی آپی جیت جائیں۔ یہ کیا بات ہوئی حماد ظہیر بھائی؟ اب ایک ایسی کہانی بھی لکھیں جس میں ذرا لڑکیوں کی لڑکوں پر فوقیت ظاہر ہو یا کم از کم اہمیت لڑکیوں کی ظاہر ہو۔ 'شام سے پہلے'، 'ضرورت ہے روم میٹ کی' تو بہت ہی اچھی تھی۔ جیومیٹری چور' بھی صحیح تھی۔ 'آوارگی کا انجام' تو اعلا تھی۔ 'ہیرے کی چوری' بھی بہت اچھی کاوش تھی۔ اپنے خط کی اتنی تعریف نہ کرتی لیکن میرا ذہن ایک دم اس طرف چلا گیا کہ جی الحمدللہ میں نے اب تک جتنے خطوط ساتھی میں لکھے ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی خط ایسا نہیں جس کے آخر میں کوئی جواب نہ دیا گیا ہو۔ جن سہیلی موصوفہ کا خط میں ذکر تھا وہ بھی بہت خوش ہوئیں۔ مزے کی بات تو یہ تھی میں اداریئے کی طرف سے لکھے گئے شروع کے جملے اور آخر کے جواب کے بارے میں دیر تک سوچتی رہی کہ جی یہ لکھا کیوں گیا ہے اور اس کا کیا مقصد ہے۔ پھر جب کافی دیر میں سمجھ میں آیا تو کافی دیر تک آآآآآ۔

☆......لو جی یہ آپ کا پہلا خط ہو گیا جس میں کوئی جواب نہیں دیا گیا ہے۔ ہے ناں مزے کی بات......

جناب ایوبی ایک رائے دے رہے ہیں

میں ساتھی کا پرانا قاری ہوں۔ اس کے تمام سلسلے ماشاءاللہ بہت خوب جارہے ہیں۔ لکھنے والوں میں 'اشتیاق احمد'، 'فاطمہ نور صدیقی'، 'فوزیہ خلیل' وغیرہ اچھے لکھ رہے ہیں۔ ساتھی کا نیا سلسلہ 'تاریخ کی کھوج' میں جوابات کی جگہ بہت چھوٹی دی گئی ہے۔ اس کے جوابات کی جگہ بڑی کی جائے۔

☆......جوابات کے لیے الگ سے صفحہ استعمال کر سکتے ہیں۔

طوبیٰ بنت عبدالرؤف قریشی لکھتی ہیں

دسمبر کا رسالہ بہت اچھا تھا۔ 'ذرا کھلکھلایئے' پڑھ کر بہت مزا آیا۔ 'آپ کی تخلیق' میں کہانیاں اچھی تھیں۔ 'رنگا کی شرارت' اور 'دشمن کا تعاقب' بہت عمدہ لگی۔ نظموں میں 'جھولی بھر بھر پاؤ گے'، 'ارے میری گائے'، 'آوارگی کا انجام' اچھی تھیں۔ 'بیچاری اسما خالہ' پڑھ کر بہت ہنسی آئی۔ 'پراسرار قلعہ' پڑھ کر تھوڑا سا ڈر لگا۔ 'تاریخ کی کھوج' کا دوسرا سوال سمجھ نہیں آیا کہ اس میں ان کے والد کا نام پوچھا ہے یا ان کی ہمشیرہ کا؟

☆......والد اور ہمشیرہ......دونوں کا پوچھا تھا۔

بلال سہیل بھی ہمارے درمیان موجود ہیں......

واہ جی وا! دسمبر کا شمارہ پندرہ نومبر کو ہاتھوں میں ہے۔ ویسے دسمبر میں تو بلدیاتی انتخابات بھی ہیں لیکن سرورق کہانی میں تو 'گھریلو انتخابات' کا تذکرہ ہے۔ 'دل پہ دستک' میں کافی مشہور شعر تھا لیکن بہت سوں کو اس شعر کا مفہوم نہیں پتا ہوتا۔ 'ساتھی چٹخارے' کیا!! ہماری کہانی چھپی ہے، وہ بھی 'آپ کی تخلیق' سے ہٹ کر۔ 'السلام علیکم' بہترین تھا۔ ہم نے بھی رائیٹرز ایوارڈ کی تقریب پر کچھ لکھنا چاہا لیکن لکھ نہیں سکا۔ 'چاچا ہادی نے ناول لکھا' بڑی مزے کی تھی۔ 'بے چاری اسماء خالہ' تھی تو اچھی لیکن یہ سمجھ نہیں آیا کہ جب اتنی آفتیں ٹوٹ پڑیں تو گھر سے بھاگی کیوں نہیں بلکہ اُلٹا امی کے اصرار پر ایک دن اور رک گئیں۔ 'پراسرار قلعہ' بھی بڑے مزے کی لگی۔ 'جیتے گا بھئی جیتے گا' میں حماد ظہیر صاحب اپنے ووٹ کا صحیح استعمال کرنے کا درس دیتے نظر آئے۔ کاش ہماری قوم بھی اس بات کو سمجھ جائے اور اندھی تقلید نہ کرے۔ 'شام سے پہلے' (الطاف حسین) ایک اور جذباتی تحریر لیے حاضر ہوئے۔ الطاف حسین صاحب کو رائٹرز ایوارڈ کی تقریب میں دیکھا اور ہمارے بالکل پاس بیٹھے تھے لیکن افسوس آٹوگراف نہیں لے سکے۔ 'آپ کی تخلیق' میں 'ہمارے اساتذہ' (مریم جمیلہ عتیق) پسند آئی۔ اور 'وہ ملے تو' پڑھ کر اپنے آپ کو کسی طرح سے بھی ہنسنے سے نہیں روک پائے۔ خط رے میں 'الیاس نواز' اور 'سمیرا' کے خط پسند آئے۔

سالنامے پر نائلہ صدیقی کا دلچسپ تبصرہ

ساتھی کا سالنامہ موصول ہوئے کافی دن ہو چکے اور لوگوں کی رائے بھی آپ تک پہنچ چکی ہوگی کیونکہ سب لوگ ہماری طرح کا ہل نہیں ہوتے لیکن پھر بھی اپنی رائے لکھ رہی ہوں۔ الہ دین کا چراغ ساتھی کے سرورق پر دیکھ کر خوشی ہوئی اور یہ راز بھی کھلا کہ ساتھی والے اتنے اچھے اچھے شمارے کیسے نکال رہے ہیں جبکہ ہم ایک کہانی بھی نہیں لکھ پا رہے۔ براہِ مہربانی یہ چراغ ہمیں بھجوا دیجیے۔ شکریہ! ''رازداں کے قلم سے'' سے اچھا اور دلچسپ سلسلہ ہے اس کے ذریعے قلم کاروں کو جاننے کا موقع ملتا ہے۔ خود ہمیں بھی بینا صدیقی کے بارے میں کئی باتیں اسی تحریر سے معلوم ہوئیں۔ ساتھی کا شکریہ! مگر یہ بینا صدیقی کا رازدان ہے کون؟ پلیز بتا دیجیے تا کہ ہم اُس سے بچ کر رہیں۔ (اب فائدہ نہیں کیونکہ آپ کا بھی تیر کمان سے نکل چکا ہے) اُمید ہے کہ حماد ظہیر اور جاوید بسام کے گھر والے بھی ان کے بارے میں پڑھ کر چونک اُٹھے ہوں گے۔ بہرحال یہ ایک اچھا سلسلہ ہے اور اسے جاری رکھنا چاہیے۔ جاوید بسام صاحب کو شکایت ہے کہ لوگ ان کی تحریروں کو ترجمہ خیال کرتے ہیں جبکہ وہ طبع زاد ہوتی ہیں۔ شاید بسام صاحب غیر ملکی ادب بہت پڑھتے ہیں اس لیے ان کی تحریروں میں مرکزی خیال اور کرداروں میں غیر ملکی رنگ جھلک اُٹھتا ہے لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ بسام صاحب سب کو پاکستانیت کے رنگ میں رنگ لیتے ہیں۔

ہاشمی صاحب نے مزے کا شمارہ کے عنوان سے تبصرہ کیا ہے تو ہم یہ کہیں گے کہ ہاشمی صاحب! آپ کے تبصرے برائے اصلاح زبان بھی بہت مزے کے ہوتے ہیں۔ ہم سے مراد میں اور کمپوزر صاحب ورنہ ہاشمی صاحب کہیں گے کہ صیغہ واحد کے لیے ہم کا لفظ کیوں استعمال کرتے رہے ہیں۔ قلم کاروں کی زبان و بیان کی اصلاح کے لیے ہم ان کی کاوشوں کی دل سے قدر کرتے ہیں لیکن جناب ہاشمی صاحب! ذرا ساتھی کے کمپوزر اور پروف ریڈر صاحبان کے بھی کان کھینچیے جو مہنگائی کو منہگائی لکھنے پر تلے بیٹھے ہیں اور کسی کی ایک نہیں سن رہے۔ (رشید حسن خان مہندی اور مہنگائی میں ن کو م کے فوراً بعد لکھنے کو ترجیح دیتے ہیں اور اسی کو درست بھی سمجھتے ہیں۔ ادارہ) کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کچھ غلطیاں کتابت کی بھی ہوتی ہیں جو لکھنے والوں کے کھاتے میں آ جاتی ہیں اور لکھنے والوں کو دُہری ڈانٹ سننا پڑتی ہے ایک اپنی غلطیوں کی دوسری کتابت کرنے والے کی غلطیوں کی۔ اس کا کیا علاج ہو؟

اشتیاق احمد صاحب (مرحوم) کی کہانی 'ایک جملے کی سزا' کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ مرکزی خیال بہت خوبصورت ہے اور زبان و بیان کی سلاست و روانی اس سے بھی زیادہ خوبصورت ہے۔ یہ یقین کرنا تو بہت مشکل ہے کہ اشتیاق احمد اب ہمارے درمیان نہیں رہے لیکن یہ یقین ہے کہ ان کی تحریریں ہمیشہ زندہ رہیں گی اور آنے والی نسلوں کی فکری تربیت میں اپنا کردار ادا کرتی رہیں گی۔ بظاہر اُنھوں نے بچوں کے لیے جاسوسی کہانیاں لکھیں جس میں لوگوں کے خیال کے مطابق اصلاح کا کوئی پہلو نہیں ہوتا لیکن اشتیاق احمد نے اس خوبی کے ساتھ ان ہی کہانیوں کے ذریعے بچوں اور

نوجوان نسل کو اپنے مذہب اور وطن سے محبت اور کردار کی تعمیر کا ایسا درس دیا جوان ہی کا خاصہ ہے اور ان کا نام زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے (آمین) دیگر تحریروں میں اعظم طارق کوہستانی کی کہانی 'سیاہ ناخن' سسپنس سے بھرپور تحریر ہے، لگتا ہے کہ اعظم طارق کو بھی اشتیاق صاحب کی تحریریں بہت پسند ہیں۔ مصنف نے بہت چابک دستی سے کہانی کا تانا بانا بنا ہے اور ہر مرحلے پر دلچسپی برقرار رہی۔ انٹیلی جنس آفیسر طاہر کہانی کی باریک بینی نے دشمن کا سارا منصوبہ چوپٹ کر دیا انجام چونکا دینے والا تھا۔

الیاس نواز کی تحریر 'گنوار چی خانہ' ایک مزے دار تحریر ہے۔ ٹی وی کے بے سروپا کوکنگ شوز کی بہت دلچسپ انداز میں نقشہ کشی کی گئی ہے۔ لگتا ہے کہ الیاس صاحب یہ شوز بہت توجہ سے دیکھتے ہیں۔ لوگ عام طور پر یہ شوز اچھا کھانا پکانے کے لیے دیکھتے ہیں لیکن انھیں دیکھ کر اچھی کہانیاں بھی لکھی جاسکتی ہیں۔ یہ راز تو اب کھلا، اب ہم بھی یہ شوز دیکھ کر پکانے کے بجائے لکھنے کی کوشش کریں گے۔ دیگر تحریروں میں وقار محسن کی 'ہم واپس آئیں گے' ایک متاثر کن تحریر ہے۔ اس کے علاوہ فوزیہ خلیل، حماد ظہیر، غلام مصطفیٰ سولنگی کی کہانیاں پسند آئیں۔ 'ناراض کھمبا' شاید ترجمہ ہے یا کسی غیر ملکی کہانی سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے ایک اچھی کاوش ہے۔ گل رعنا نے کسی 'قاتل بلی کی ڈائری' کو اُردو کا جامہ پہنایا ہے۔ نجانے اس بلی سے گل رعنا کی ملاقات کہاں ہوئی۔ کہانی دلچسپ ہے اور ترجمے میں روانی ہے، خاص طور پر اگر وہ بہن کی نظروں سے پڑھا جائے۔ بینا صدیقی کی کہانی دو نمبر کا مرکزی خیال جان دار ہے اور ہمیں اس سے پورا اتفاق ہے لیکن بینا صدیقی کا کیا بھروسہ کہ وہ ہماری رائے کو بھی دو نمبر سمجھ بیٹھیں۔ بہر حال کہانی پڑھنے میں مزا آیا۔ عظمیٰ ابو نصر کا مضمون 'باغ کا سودا' ایک اچھی تحریر ہے۔ البتہ 'اوکاپی کی تلاش' ہمیں سمجھ میں نہیں آئی۔ اس کا مطلب ہے کہ اچھی ہی ہوگی۔ نہ سمجھ میں آنے کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ہم افریقہ کے وسط میں دریائے کانگو کے کنارے نہیں پیدا ہوئے۔ عنایت علی خان صاحب کا انٹرویو نہایت شگفتہ اور برجستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو صحت کے ساتھ زندگی عطا فرمائے اور وہ اسی طرح اپنے قلم کی شگفتگی سے ہم سب کو خوش کرتے رہیں۔

شعری حصے میں احمد حاطب صدیقی، تنویر پھول، عنایت علی خان، شوکت پردیسی اور ضیاء الحسن محسن کی نظموں نے سالنامے کا مزا دوبالا کر دیا۔ لطائف کے اوپر آپ نے یہ حکم دے رکھا ہے۔ 'ذرا کھلکھلائیے' چنانچہ دل پر پتھر رکھ کر ان لطیفوں پر مسکرا دیتے ہیں ورنہ کچھ لطیفے تو ایسے ہوتے ہیں جن پر کھل کھلانے کے بجائے بلبلانے کا دل چاہتا ہے شاید اسی بات کو بھانپتے ہوئے آپ نے 'ذرا' کا لفظ استعمال کیا ہے یعنی زیادہ نہیں کھل کھلانا بس ذرا سا۔

اسکیچز میں بہت بہتری آئی ہے۔ رنگین تصاویر بھی خوب ہیں۔ تحریروں کی ترتیب والے صفحے کی آرائش اچھی لگی۔ مجموعی طور پر سالنامہ عمدہ ہے۔

☆......☆
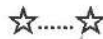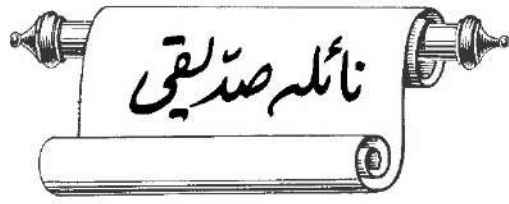
نائلہ صدیقی (نائلہ ارم)، شعبۂ ابلاغ عامہ (جامعہ کراچی) کے سربراہ جناب طاہر مسعود کی لائق شاگردہ ہیں۔ شعبۂ ابلاغ عامہ میں ماسٹر کرنے کا راستہ اُنھوں نے ہی، 'بینا صدیقی' کو دکھایا۔ روزنامہ جنگ میں **Intership** کے دوران نائلہ کو 'شبانہ شفیق' جیسا اچھا ساتھ ملا۔ جنگ مڈویک میگزین کے لیے بے شمار مضامین لکھے۔ 'سیما صدیقی' نے 'آنکھ مچولی' (کراچی) کے عروج کے زمانے میں لکھنا شروع کیا، بعد میں جب 'نائلہ' نے لکھنا سیکھا تو وہ بھی 'آنکھ مچولی' میں چھپنے لگیں۔ پھر 'آنکھ مچولی' بند ہوگیا۔ مگر یقین کیجیے کہ اس میں نائلہ کی تحریروں کا کوئی ہاتھ نہ تھا۔ نائلہ نے شعبۂ ابلاغ عامہ کے لیے میگزین 'مصحف' نکالا۔ اس سلسلہ میں 'جناب سلیم مغل صاحب' سے رہنمائی حاصل کرنے کا موقع ملا۔ آنکھ مچولی کے بعد، نائلہ نے 'ساتھی میگزین' کے لیے لکھنا شروع کردیا...... تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ ایک 'آئل کمپنی' کے شعبۂ تعلقات عامہ سے وابستہ ہوگئیں۔ بقول جناب طاہر مسعود 'ملازمت کو پیاری ہوگئی ہیں جو بہت غلط ہے۔' نائلہ کو لکھنے لکھانے کا وقت کم ملتا ہے اور کچھ موڈی بھی ہیں، کئی کہانیاں ادھوری لکھ لکھ کر اپنے رجسٹر میں رکھ چھوڑی ہیں، خود ہی کہتی ہیں کہ مزے کی نہیں......اور جب لکھنے والے کو خود ہی مزا نہ آئے تو پڑھنے والے پہ ظلم کیوں کیا جائے، شاید وہ بقول محبوب خزاں ......کم کہو، اپنا کہو، اچھا کہو...... کی قائل ہیں۔ لکھنے میں اتنی سستی دکھاتی ہیں کہ خاص نمبر کے لیے لکھنے کا اصرار کرنے والوں کو محض وعدوں پر ٹالتی رہتی ہیں یہاں تک کہ اگلے خاص نمبر کا وقت آجاتا ہے، خیر ان کی کہانی 'عام نمبر' میں بھی چھپ جائے تو وہ 'خاص' ہو جاتا ہے۔ ان کے خاص موضوعات بگڑے ہوئے بچے، پکنک پارٹی اور مہمان ہیں۔ خاص طور پر بگڑے ہوئے بدتمیز بچے! مگر افسوس کے جو بچے بگڑے ہوئے ہوتے ہیں وہ 'ساتھی' نہیں پڑھتے ورنہ اب تک سدھر چکے ہوتے۔ ساتھی کے ایک مدیر صاحب نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ صدیقی سسٹرز کو کہیں کسی 'این جی او' نے بچوں کو سدھارنے کا 'ٹاسک' تو نہیں دے رکھا؟ مگر نائلہ کا خیال ہے کہ سدھرنے کی ضرورت بچوں کو نہیں......ان کے ماں باپ کو ہے! کیوں کہ وہی بچوں کو بگاڑتے ہیں۔

نائلہ کا کہنا ہے کہ ان کی 'کہانیاں' اتنی 'مزاحیہ' نہیں ہوتیں، جتنی ساتھی کے 'پروف ریڈر صاحب' اسے بنا دیتے ہیں۔ اس کے لیے وہ ذاتی طور پر ان کی شکر گزار ہیں۔ نائلہ پوری سنجیدگی کے ساتھ 'ساتھی' کی شکر گزار ہیں کہ ان کے مدیران حضرات، گاہے بگاہے ان کے اندر سوئے ہوئے 'ادیب' کو جھنجوڑ جھنجوڑ کے جگاتے رہتے ہیں ورنہ وہ کب کا 'لکھنا' بھول چکی ہوتیں۔ نائلہ، خوش طبع ہیں، باتیں کرنے میں ان کو مزا آتا ہے بہ شرط یہ کہ سننے والے کو بھی مزا آئے۔